

انارکلی

انارکلی

سعادت حسن منٹو

مکتبہ اُردو ادب

بازار ستھان اندرون لوہاری گیٹ، لاہور

جملہ حقوق بحق صنفیہ منسٹو محفوظ ہیں

ناشر ————— محمد نواز

اہتمام ————— سر فراز احمد

مطبع ————— منظور پریس لاہور

قیمت ————— پے

تہذیب

۷	وقار عظیم	منٹو کا فن
۷۸		انارکلی
۸۶		نعمت
۹۷		بدتمیزی
۱۰۶		قادر اقصائی
۱۱۵		خودکشی
۱۲۵		پشاور سے لاہور تک
۱۳۷		بجلی پہلوان
۱۴۲		ایک زائدہ ایک فاحشہ
۱۵۴		شیدا
۱۶۴		بڈھا کھوسرٹ

منٹو کا فن

سید وقار عظیم

منٹو کو اسکی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موٹنگانی، اس کی دُور بین و دور رس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے۔ اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے مطعون کیا گیا ہے۔ اور اس داؤدِ تحمین اور ہجو و تضحیک میں لوگوں کا جو رویہ رہا ہے اس میں حق پسندی اور توازن بھی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط و تفریط کا جذبہ غالب آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے۔ منٹو ایک مثالی ہیرو بھی نظر آتا ہے اور مثالی ولن بھی۔ کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اسے بس حسن کا مجسمہ سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں برائیوں کے سوا کچھ

نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے۔

توان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔

دنیا کی ہر چیز کی طرح منٹو "محض" اچھا ہے اور "محض" بُرا۔ اس کے افسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محض برائیوں کے حامل۔ اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موٹگانی، اس کی دور رس اور دور بین نظر، اس کی جرأت آمیز حق گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فقرہ بازی کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہیں۔ کبھی بہت بُرے۔

ان اچھے بُرے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے۔ جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے۔ نکلرک، مزدور، طوائف، رند خرابات اور زائد پاکباز، کشمیر یا بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چائے خانے، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی الجھنیں اور ان ساری چیزوں سے پڑھ کر جنس اور اس کے گونا گوں مظاہر منٹو کے موضوعات ہیں۔

ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں۔ بعض کو چوں میں پہنچ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے۔ وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی اور بعض افراد کا ذکر وہ جس ادائے خاص سے کرتا ہے۔

وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض رموز

آشکارا کرنے میں اسے جو مزا آتا ہے۔ وہ دوسری باتیں کہتے اور کرتے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن ذکر کسی کو چمے کا ہو اور کسی بات کا ہو۔ یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا۔ کہ منٹو اس کو چمے کے سارے پیچ و خم، اس شخص کے دل کے سارے بھید اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں جہاں تک ان گونا گوں موضوعات کا تعلق ہے۔

ان کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے۔ بہت سوں کی بڑائی مول لی ہے۔ اور بہت سوں کی گالیاں سُنی ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں نے ان ہی گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر دبی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لیے اس کے لیے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے۔ اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے۔

جن کا منٹو نے پوری فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے۔ اور اس نقطہ نظر کی بھی اہمیت ہے۔ جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے۔ لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا۔ جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی۔ جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہم عصر نہیں۔ وہ اس کا فن ہے اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ لکھا جائے۔ اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں۔ فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی

ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں۔ ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے۔ اور اس اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا حدیں ہیں۔ شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطہ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منطقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے۔ تکنیک کے وہ مبادیات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔

داستان، ناول، ڈرامہ اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار، ڈرامیٹسٹ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈرامہ یا افسانہ لکھتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرضِ اولین جانتا ہے۔

ایک خاص صنفِ ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے۔ اس کے غلوں اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ صنفِ ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انہیں پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جاننا، سمجھنا اور ان کا صدقِ دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے۔

جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔ اس لئے کسی فنکار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے۔ کہ اس فنکار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو، ان اصول و قوانین کو اس کی روایات کو کس حد تک جانا، سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فنکار نے فن کی روایات کی پابندی کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کیے ہیں۔

ان مختلف وسائل کے استعمال میں فنکار کے تخیل، فکر اور ذہنی کاوش اور انہماک و توجہ کو خاص داخل ہوتا ہے۔ اس لیے جو فنکار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے۔ اسی حد تک اس کی توجہ، انہماک اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار اور ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔

اظہار اور ابلاغ کی یہ منزل ہے جہاں مصنف کا تخیل اور فکر جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر ہیں۔

اظہار اور ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ یہی رنگ مصنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا مظہر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے جس میں فنی روایات اور اظہار ابلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

• فنی جائزہ لیتے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فنکار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیش نظر نہ رکھی جائیں تو یہ فنی جائزہ ادھورارہتا ہے۔

ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں جو نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے۔

ان پہلوؤں کا تیکھا پن اور اس رنگ کی شوخی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے اعصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے تو فن کار رنگ بھی پھیکا ہونے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اس لیے کہ ان حقائق کو پیش نظر رکھے بغیر فنکار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں اس خطا ط پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوب اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جو اس کے فن کی ابتدائی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ظاہر ہونے کے بجائے صرف کبھی کبھی اُبھرتے اور اندھیرے

میں چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

منٹو کے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجہ اتم موجود ہیں اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں۔ اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سُراغ نہیں ملتا۔

افسانہ، ناول، ڈرامہ، داستان، کہانی ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ اس قصے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقعہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ تک اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص اندازِ فکر و نظر یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ اس کہانی میں بھی جو بڑی بوڑھیاں رات کی خاموشی میں بچوں کو سناتی ہیں۔

اس افسانے، ناول اور ڈراما میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن ان کئی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک نہ ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے۔ جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔

داستان میں سخیل اور قصور کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کشمکش ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی اکائی پر امتیازی اور انفرادی خصوصیات ہیں۔

افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور معنوی ہوتی ہے۔ ایک

کردار، ایک واقع، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو، عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیاد کی خصوصیت کی طرف سے غفلت برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا تاثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیئے۔

اُردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ لیکن کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں ان سے کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فنکار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پوری فنی زندگی میں کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا۔ کہ انہیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔

ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں۔ یعنی منٹو کا ہمہ گیر مشاہدہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے۔

اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے واقعہ اور کردار کے ذکر میں منٹو بہت کم اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کئے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں۔

لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فردی اور

جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحولی یا کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری نہیں بناتے۔

یہ سارا علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر، جذبہ، ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ مثلاً ان کے افسانے نیا قالون، خوشیا، نفرہ، اور نیا سال پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے سخیل، فکر اور تجزیہ، حیات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔

افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی ان گنت تصویریں اس کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان سے حسب موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے۔ لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے مصورانہ قلم کے بنائے ہوئے یہ بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ چیز نیا قالون، خوشیا، نفرہ، اور نیا سال، کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور لفظی رنگارنگی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس جذباتی

کیفیت کے ترجمان ہیں۔

جس میں ایک خاص فرد مبتلا ہے۔ (منتر) اور دمیرا اور اس کا انتقام، اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بناء پر شروع ہوتے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منفرد خصوصیات کا عکس ہے لیکن افسانہ پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے زیادہ نمایاں اثر قبول کرتا ہے۔ وہ صرف ایک واقعہ ہے۔

ایک صورت میں واقعہ کی ہلکی پھلکی ہنا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاج کا ایک ملاحظہ تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔

اسی طرح ”ہتک“ ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بسنے والے گونا گوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر ”ہتک“ کئی ہیروئن ”سوگندی“ کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔

وہ ساری فضا جو افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضا کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے مل جل کر ”سوگندی“ کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود ”سوگندی“ ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم ”سوگندی“ کے علاوہ باقی سب چیزوں کو، باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔

وہ گمرد و پیش کی ہر چیز پر غالب آکر اس طرح بچھا جاتی ہے کہ ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ صرف ”سوگندی“ کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جسے ہم برسوں سے اسے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہلکا راز ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گزری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض منزل کی۔ لیکن ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعے صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اُتارنی اور جاگزیں کرنی ہے افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے۔

لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعے قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے۔ اپنے افسانے کا ایک ڈھانچہ بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح شروع ہوگا، کس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہوگا۔

اچھی کہانی کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس عجیبی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔

فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطہ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں۔ جنہیں ہم افسانہ کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔

افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم جا کر ہمواری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں۔ جو افسانہ کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کبھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں برتتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔

منٹو نے ایک دیانت دار اور مخلص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی

میں جانی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔

منٹو نے اچھے اور بُرے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو۔ لیکن افسانے کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف موقوفوں پر مختلف کام کیے ہیں۔ لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا۔ قاری کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔

منٹو کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگائیے کہ تمہید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے کن کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

”نیا قانون“ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

”منگو کو جوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا مٹھہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دُنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچران جن کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ دُنیا کے اندر کیا سہو رہا ہے اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔“

اسی طرح ”بلاؤنڈ“ کی تمہید یہ ہے:-

”کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا بھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت، باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ الیا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا“

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر کساتی اور مجبور کرتی ہے۔

دو تمہیدیں اور دیکھئے:-

”گھر میں بہت چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے، لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بلبلا رہے ہیں تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھوکی لیے بے سری تائیں اڑا رہی ہیں۔ نہ سال کی خبر ہے نہ لے کی، بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل تک مکان مہانوں سے کچا کچھ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو، ایک مکان میں دو بیاہ رہے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاندسی ڈلہیں بیاہ کر لائے تھے۔“

”میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک تھوڑے پہلے پولو بندر پر ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھی۔ جو ساحل کے پنج پر بیٹھ کر دیکھنے سے مولے کپڑے کی لہریں معلوم ہوتی تھیں میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا پنج چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سر اپنے سر کی مالش کر رہا تھا، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت گہرے رنگ کا قالین ہے۔ جسے ادھر سے ادھر سمیٹا جا رہا ہے۔“

پہلی تمہید ”شو شو“ کی ہے اور دوسری ”بانجھ کی“ دونوں تمہیدوں میں افنانہ نگار نے آنے والے واقعات کے لیے ایک فضائیتار کی ہے اور اس فضا میں دونوں موقعوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افنانوں کو آگے بڑھتا ہے۔

”بھابھا“ کی تمہید صرف ایک جملہ ہے لیکن اس جملے سے افنانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے:-

”گوپال کی ران پر جب یہ چھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔“

گوپال کے متعلق افنانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے

اوسان بھی تھوڑے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہو گا۔ یہی افنانہ نگار کی حیت ہے اس نے ایک معمولی سی خبر سنا کر قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افنانے کی تمہید دیکھیے :-

”ایک نہایت ہی تھوڑا کلاس ہوٹل میں دیسی دسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور دسکی کے پیدا کردہ ٹکڑ کو دور کر سکے“

یہ تمہید ”پہچان“ کی ہے اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے نہ کوئی نفا یا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے بلکہ بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ۔ اگر تم بھی ان شرا بیوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔ اور معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے۔

اور سنئے :-

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساقوں میں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں“

”یہ نعرہ“ کی تمہید ہے اور اس میں افنانہ کے مرکزی کردار کشمورال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی ہے

گاکا افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لئے کہ کیشو لال کے اعلیٰ شدید احساس کے پیچھے کیا واقعہ کام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی غلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

”دن بھر کی تھکی ماندی دہا بھی ابھی اپنے اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی بڑیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔“

یہ تمہید ”ہنسک“ کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی شکار کئے ہیں، اس لئے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھسان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سیدھے سادھے انداز میں کہنے کے بجائے ذرا تیکھے تیور کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان تیکھے تیوروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تھک مار کر سو جانے والی اور اپنی بیوی کا محبوب داروغہ صفائی آگے جا کر کیا گل کھلاتے ہیں، افسانہ کے منبجہ ہار میں کود پڑتا ہے۔

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ ان ہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تمہید ہے جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے، اگر دار کو متعارف کرنے کا، ایک

خاص فضا یا ماحول بنانے کا، ایک پھر ملتی ہوئی خبر سنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مقصوری کرنے کا، آنے والے واقعات کے لیے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی یہ یک وقت کئی ملے جلے مقصد پورے کرنے کا، لیکن ان گونا گوں

کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افسانہ کی ہر تمہید نے اپنے ذمہ لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کر کے، اس کے دل میں لگدگی پیدا کر کے یا اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کر کے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔

منٹو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل ملے کرنے کے لیے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعے پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جاتا اور اسے افسانہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی کی طرف مائل کرتا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں ہیں۔ جن میں طرح طرح کی صعوبتیں مسافر کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کانٹے ہیں جو اس کے تلووں میں چبھنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔

افسانہ پڑھنے والا ان صعوبتوں کو اُسامان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے افسانہ نگار کی راہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر افسانہ نگار کی راہنمائی اسے منزل مقصود تک پہنچاتی ہے، جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کٹھن منزلیں ملے کرنے اور چبھنے والے کانٹوں کی خش کو گوارا اور

آسان بنالینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے سکون و راحت کا سرمایہ بہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لیے قابل قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی ذرا سستی، ذرا سی تن آسانی، ذرا سی سہل انگاری اور بالکل معمولی کردار، غفلت اور تھکن اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتی ہو۔

منٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کر کے عموماً اپنا فنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس ”انجام“ سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ منٹو کے بعض افسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا افسانہ ”نیا قانون“ اس طرح ختم ہوتا ہے:-

”اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر وہ ’نیا قانون‘ نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک

نہ سنی۔

”نیا قانون“ نیا قانون کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی ہے پُرانا؟
اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

’پھام‘ کا انجام یہ ہے:-

”نرملہ بڑے انہماک سے پھام ترکش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں
تینپنی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھام کا ٹہنے کے بعد اس نے
تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلا دیا اور گردن جھکا کر اپنے کُرتے کے بٹن
کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
ٹنکی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بلبلا لگا ہوا ہے۔

نرملہ نے پھام پر ہونک ماری اور اسے اُبھار پر جھادیا۔

”شہ نشین“ کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

”وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی

تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں

کہا:- ”مجھے زندہ رہنا ہو گا“

اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس تھکی

ہوئی جوانی کو اُدھکتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ

پر چلا آیا اور سو گیا۔

- ”ہتک“ کی ہیروئن ’سوگندی‘ ہم سے اس طرح رخصت ہوتی ہے :-
 بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی
 جب اس کو اپنا دل پر جانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش
 زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پتنگ پر اسے پلو میں
 لٹا کر سو گئی۔

”..... اس کے حلق سے ایک نعرہ کان کے پردے پھاڑ
 دینے والا نعرہ، پچھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا — ہمت
 تیری.....!“

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اُونگھ رہے تھے ڈر گئے اور ہٹھکھٹھانے
 لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ
 کیے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی عمارت اڑا
 اڑا دھم سے نیچے گر گئی ہے اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے
 جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا۔ ”پگلا ہے“

(نعرہ)

”..... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی

• سب معاملہ صاف ہو گیا۔ سیلواجی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپہ مار گئے تھے۔“

(میرا اور اس کا انتقام)

”اس واقع کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر اٹکار ہے گا“

(نامکمل تحریر)

”جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا ”ڈاکٹر صاحب! اس کی مٹھی میں کچھ ہے“ میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلب تھے۔ اس کی بیگو کی یاد گار!

”ان کو نکال نہیں۔ یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے“ میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لئے دفتر چلا گیا“

(بیگو)

”وہ گہرا کراٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رکھنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیٹے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا ”اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے۔۔۔۔۔“

(سجدہ)

منٹو کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے والے کو اپنے ذہنی انتشار کے مجتمع کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں سے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا۔ اور بڑھتا رہتا تھا۔

دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہو کر برابر زیادہ منظم بناتا رہتا تھا۔ افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منٹو نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انہیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

• ”نیا قلوبن“ کے خاتمہ میں استاد منٹو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایسا مستند ردِ عمل ہے جس سے پڑھنے والے کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ ”پہلا“ کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا سیدھا سادا اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔

”نشہ نشین پر“ کا انجام جذباتی کھینچاؤ، کشمکش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فن کارانہ حل کی تصویر ہے۔ ”ہتک“ کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید ردِ عمل اور زندگی کے ایک بڑے دکھتے ہوئے ناسور کو بظاہر ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سو گندی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم نوا ہو کر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سو گندی کے نزدیک قابلِ نفرت ہے۔ ”نعرہ“ کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کینولال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فضا کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی ٹریسڈی کو تلخ تر بنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی تلخی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا منٹو کے افسانوں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔

”بیگونا“ انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو نے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے

کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گزار دیتے ہیں۔ جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ یہ معمولی سی غیر اہم بات گذرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔

”میرا اور اس کا انتقام“ میں آخری جملے میں بھی ہوئی ہلکی سی ایمائیٹ کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادھے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور عریض نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔

”نامکمل تجربہ“ میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے روحانی واقعہ کو ایک ناقابل فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔

”سجدہ“ کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ فن کے نقطہ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی

تا خود کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اس مسرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔

ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرت بیان اور اس کے انداز فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ کبھی محض سادگی بیان سے، کبھی تضاد سے کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شوخی سے، کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانہ کے خاتمہ کا یہ انداز پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔

افسانہ نگار کے خاتمہ کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، فطانت، اور شوخی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں۔

افسانہ اُتار چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ ممکن کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔

افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے۔ افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم معناں اور ہم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام۔ ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے بھی

غفلت یا بے نیازی برتے تو افسانہ کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ منٹو کو فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لئے ان کی ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے۔ جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن اس سے وہ متاثر اور مسرور و مغرور ہوتا ہے۔

افسانہ شروع ہو کر دھیمی لیکن پتی تلی چال سے، بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے۔ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دھیمی اور چُپی تلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔

یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔ ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آجاتی۔ اس میں لکھنے والے کو پورے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ کوئی کڑی ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھلکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کو اس ربط میں ایک خوشگوار جھٹکا رکاوٹ تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔

ہمارے کم افسانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھکاؤ کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنہوں نے دی ہے انہوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔

منٹو کے فن کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کبھی نہ بھلاتے ہوئے ہمیشہ ہر افسانے کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور آثار چڑھاؤ کو پوری فنی ذمہ داری کے ساتھ برتا ہے۔

منٹو کے نزدیک فن کے ان مراحل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ منٹو کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجئے۔

”نیا قانون“ کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہو جانے کے بعد بھی اسے ایک گورے سے لڑنے کے جرم میں حوالہ ست میں بند کر دیا جاتا ہے۔

اس آغاز اور انجام کے درمیانی حصوں کو اس طرح پُر کرنا کہ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لیے ہر درجہ کرب انگیز بن جائے۔ منٹو کے فنی احساس کی پیدائش کی ترتیب تنظیم کا مظہر ہے۔

یہی صورت ”کالی شلوار“ کے ساتھ ہے۔ کالی شلوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات میں ایسا اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ در پیچ مراحل سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے۔ بغیر صرف ان لغیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔

”کالی شلوار“ طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لئے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

کہانی کے مختلف ٹکڑوں میں یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں۔ اور دونوں منطقی طور پر یوں شہ و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں۔

منٹو کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے افسانے میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں)

موجود نظر آئے گی۔ منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعے بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

(۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو ہے جس کا ذکر ہیں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مصنوعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر سبھی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا اتار چڑھاؤ، پینچ اور الجھاؤ کے بعد افسانہ کا نقطہ عروج اور اس کا خاتمہ ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے دو سب سے اہم چیزیں ہیں۔

منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزاء اور عناصر کو جو اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منٹو ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لئے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک محفوم تاثر قائم کرنے کے یقینی وسائل

ہیں گویا فن کار کا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لئے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یا ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تاثر انگیزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لیے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے برتے اور استعمال کئے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔

یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے۔ لیکن ان سے بھی خاصیت اظہار اور ابلاغ کے ان طریقوں کو حاصل ہے۔

جنہیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادھی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا انداز کیا ہو، اس کے لیے کسی خاص محل پر سیدھے سادھے فقرے، اشارے، کنایے، تشبیہ، استعارے، تضاد یا تکرار میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہو گا یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور ان صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لیے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔

لفظوں، فقروں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص

اور منفرد انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔
 منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطہ نظر سے پرکھنے
 اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر
 کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لیے ایک غیر معمولی انداز
 موجود ہے۔

فقہہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی لفظوں کے برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی اور
 بہت اہم اور بڑی گہری بات کو اس طرح ادا کر دیتے کہ جیسے وہ بات نہ اہم ہو نہ
 عینی منٹو کے انداز اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔

بعض ٹکڑے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے
 کی کوشش کیجئے۔

۱۔ سب سے پہلی مثال ”نیا قانون“ کی ہے۔ استاد منٹو نئے قانون کی خبر سن
 کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہے اتنے میں
 منتھو گنجا اڈے پر آنا ہے۔ منٹو بلند آواز میں اس سے کہتا ہے۔

”ہاتھ لا ادھر، ایس خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس گنجی کھوپری

پر بال اک آئیں“

۲۔ ”بہیمان“ میں بازار حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے — ”یہ رنگ

برنگی عورتیں مکانات میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکتی رہتی ہیں۔ آپ

نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔“

۳۔ ”پہچان“ ہی میں ایک لڑکی کا ذکر یوں آیا ہے ”مروڑیاں اسی کے ہاتھوں سے بچے فرس پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آماج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔“

۴۔ ”پہچان“ میں ایک اور بازاری عورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار و دکاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پورا تول نہیں تولے گی۔“

۵۔ ”شوشو“ میں ایک جگہ کہا گیا ہے۔ ”شوشو — شوشو — ارے یہ کیا؟ دوہین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیر منٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔“

۶۔ ”شوشو“ ہی میں سونے سے پہلے کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے۔ ”میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روٹی کے بہت بڑے انباہ میں دھنسا جا رہا ہوں۔“

۷۔ ”خوشیا“ میں۔ ”کاشا کا ننگا جسم موم کے تیلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اند جا رہا تھا۔“

۸۔ آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں (بانجھ)

۹۔ ”محبت کا استغاثہ بھی ہو سکتا ہے۔“ (بانجھ)

۱۰۔ "اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرے کو بلم بنا لیا تھا کہ وقت پر کام آئے (نعرہ)

۱۱۔ "جب ٹیکبل نے بیسنے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے

اندر رہنے کے کئی عبادے پھٹ گئے ہیں۔" (بلاؤنہ)

۱۲۔ "نقشہ کے دل پر ایک گھونسلہ سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ دوپہر کی دھوپ

میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے داغ میں گھس کر چھیننے لگی ہیں (اس کا پتی)

۱۳۔ "کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت ادب پٹی ٹٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا

نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا ہے اور پھر اس ہوا میں دم

گھٹنا بھی ایک خاص مزادیتا ہے" (ہنسک)

۱۴۔ "فضا میں نیندیں گلی ہوئی تحقیق، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی

ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے

ادنی کپڑے" (دھواں)

۱۵۔ "میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنکھی کرنا شروع کر دی۔ میں یہ

محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اگلے ہوئے خیال میں جن کو میں اپنے

نہیں کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔"

۱۶۔ اسے صرف اپنے آپ سے نوحہ تھی اور بس۔ دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ

اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا تھا (نیا سال)۔

۱۷۔ "محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لے کر ماسٹر نانا تک سب محبت

کرتے ہیں (قبض)

۱۸۔ "زندگی کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ادنیٰ جزا ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ طلسم جیسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائے گا (مصری کی ڈلی)

منٹو کے انسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے انداز بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثال نمبر ۱ میں منٹو نے جب یہ بات کہی کہ ایسی خبر سناں کہ جی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن یہ نظر ہر معمولی ہونے والی بات منٹو کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منٹو نے منٹو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور گہنے نکتوں کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منٹو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منٹو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لئے منٹو نے جو جملہ واضح کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سنجیدہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال نمبر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آتی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے نئے پن کا احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا

لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ آپ نیچے سے دھیلے اور پیچھا مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔ تو پوری تشبیہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے اس لئے کہ یہ جملہ جو خیال یا زبان کے اعتبار سے بالکل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے بازاری عورت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں مشاہدہ کی جو بار یک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرز فکر کی ایک خصوصیت ہے لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ مرد ڈیاں پیچ کر رہی تھیں اس کے لئے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لئے اکثر لکھنے والوں کو بجز فکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے گوہر آبدار نکلانے کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبہ کے اظہار کے لئے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دینا کہ جیسے کی ظاہری حیثیت تو سادہ و حقیر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کئی گنا زیادہ ہو جائے۔ منٹو کی قدرتی بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ادنیٰ اس لئے کہ یہ کرشمہ کبھی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت مثال میں رقم کی ہے۔ جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک تابل نفیرین ہے۔ اگر ایسے لفظوں کے ذریعے ظاہر کی جائے جو یہی طور پر جذبہ نفرت کے منظر ہوں تو بیان میں عمومیت آ جائے۔ منٹو نے اپنے

انداز کو ہمیشہ عموماً سے بچایا اور سادگی بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنالیا ہے مثال نمبر پانچ تا نثر انگریزی کی خصوصیت کے لحاظ سے ادب کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پیپر منٹ کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لئے بھی شو شو کے نام میں وہی لذت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پوری طرح آشنا ہے۔

چھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے انداز بیان کی ندرت اور قدرت کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور نازک اور لطیف جذبہ مجسم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے جاتا ہے۔ ایک غیر مرئی اور غیر مادی حس ایک ٹھوس اور مرئی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کئے ہیں۔ بانجھ اور استقاط کا ایک واضح لغوی مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس لئے منٹو جب محبت کے لئے یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہو سکتی ہے۔ اس کا استقاط ہو سکتا ہے تو ہمارا ذہن اس کا جو فوری تاثر قبول کرتا ہے اس میں الجھن اور تکدر کی ایک مٹی جلی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب وہ نئے سیاق و سباق میں ان لفظوں کے مفہوم پر غور کرتا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ منٹو نے ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے

اظہار کے لئے دو ایسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس ناسقہ اور بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں تھے۔ لیکن منٹو کی چابکدستی کی بدولت ان دونوں معمولی اور حقیر لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انہوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا
 بڑی کامیابی سے کر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے وہ اہل نہیں تھے بلکہ پڑھنے والوں کے لئے سوتج بچار کے دروازے بھی کھول دیئے۔ منٹو کے اسلوب کی جدت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔ یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔
 دسویں سے بیکر پندرہویں مثال تک ہر جملہ محوڑے بہت فزنی کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ جملوں سے، کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے محلی معلوم ہوئیں۔ جہاں منٹو نے انہیں کامیابی سے برتا ہے اور کبھی بہت سی لمبی جملی واضح تصویریں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل تاثر قبول کر لیتا ہے۔ دل کی بات ایک زندہ اور مرئی حقیقت بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور بالا اعلان کہتی ہے کہ دیکھو یہ میں ہوں مجھے ابھی طرح پہچان لو اور دیکھتے والا ایک ہی نظریں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لئے ناقابل فراموش بن جاتی ہے۔

سولہویں مثال میں منطوق کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر سننا کہ فوراً ایک دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ مخصوص کیفیت جس کا بیان مقصود ہے۔ آئینہ کی طرح روشن اور سورج کی طرح تاباں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

سترھویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے یہاں انسانہ نگار نے ہمیں ایک خبر یہ کہہ کر سنائی کہ حجت ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لئے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور طنز کی ایک معلیم ہونے کے باوجود اس قدر منطقی ہے کہ سننے والا اسے جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ منطوق کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں۔ یہاں بھی سادگی بیان اور اہم ترین بات کو حد درجہ معمولی سمجھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت برابر کار فرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منطوق کے فکر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی امیزش اور امتزاج ہے جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادی عبارت اور معمولی سی تشبیہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقیں واضح کرنے کا بہترین اور مؤثر ترین انداز وہ ہے جسے منطوق نے اپنا یا ہے۔

• منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں بالکل حقیر اور بے حقیقت نہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقرہ میں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شاہجہانہ مک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور مؤثر سے مؤثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عزمیت کو نصیر آفریں، نکدہ انگیز اور خیالی افروز بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لئے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں اور دنام کو نہیں ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی منظر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر یہی بے تکلفی اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا پرتو نہیں منٹو کی ان تشبیہوں میں جس نظر آتا ہے جو اس کے ترکش فن کے بڑے جید افغن تیر ہیں۔

ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگائیے کہ منٹو کا ہمہ رنگ اور ہمہ صفت فن ان تشبیہوں میں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

”استاد منگو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے۔“

”ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی

- ہے۔ جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر تھڑ رہی ہو۔“

(نیا قانون)

منٹو کے دل میں (یا منٹو کے کسی کہ دار کے دل میں) کسی چیز کی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ مفروں اور جملوں کی کمی نہیں۔

اسی طرح ان کا ذہن تازہ مشکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کر لینے پر قادر ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہمہوا بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے اور اکثر بالکل معمولی معمولی تشبیہوں سے وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جینا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اُتار دیتے تھے کہ وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے۔

اُستاد منٹو کی زبان سے مار وارٹیوں کو غریبوں کی کٹیائیں گھسے ہوئے کھٹل کھوانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرنے میں کہ ”نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا“ منٹو کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب اُستاد منگو کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ ایک وقت آنے سے سانسے کی بندوقوں کی گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتیش بگولابن کر اُپر کو اڑ گئیں۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے برعکس صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مڑی ہوئی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں یوں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں لیکن منگو کا دور رس تصور ہمیشہ دو چیزوں میں موزوں ترین مشابہت تلاش کر کے اسے بڑی برجستگی سے صرف کرتا ہے اور ایک معمولی اور بظاہر بے حقیقت سی تشبیہ ایک مکمل مفہوم کی حامل اور ایک گہرے تجربہ کی عکاس بن جاتی ہے۔

بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں جیسی اور بہت سی سیدھی سادھی لیکن اپنے تاثر کے لحاظ سے اہم تشبیہیں منگو کے ہر افنانہ میں قدم قدم پر ملتے ہیں۔

ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے :-

” وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لمیوں پنچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے۔“

(بچان)

”اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے

ماند کھلے ہوئے تھے۔“

(شو شو)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کانا برہنہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز اس نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ ”کیا حرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے۔“ یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرے طرے کے روپ بھر کر اسے ستاتی اور پریشان کرتی ہے۔ ان بے شمار روپوں میں سے ایک یہ ہے۔

”خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اُدھکتا

رہتا ہے۔“

(خوشیا)

”باجھ“ میں ایک منظر کا تصور منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:-

”کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے مارن کی آواز بلند ہوتی

اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران کسی نے

زور سے ’ہوں‘ کی ہے۔“

یہ تشبیہ بھی غیر معمولی نہ ہی لیکن اس تک منٹو کے سوا کسی اور کے ذہن کی نارسائی

اسے غیر معمولی ہی بنا دیتی ہے اور منٹو کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

”گالی ————— یوں سمجھیے کہ کانوں کے راستے پگھلا

ہوا سیہ شاہیں شائیں کرتا اس کے دل میں اُتر گیا۔

(غزہ)

”بار بار یہ دو گالیاں، جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں، اس کے کانوں کے پاس زمرہ کی بھڑوں کی طرح جھنخانا شروع کر دیتی تھیں۔“

(غزہ)

”دو گالیاں — اس کے جی میں آتی کراہنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی جیلے گلے ہی نہ تھے، باہر نکال لے۔“

(غزہ)

ایک گالی یا دو گالیاں — میرے اور آپ کے لیے دوستی سنائی بے حقیقت باتیں ہیں۔ جنہیں آدمی صبح سے شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلے سنا ہے۔ لیکن کیشو لال کے دل میں ان گالیوں نے جواثر کیا ہے۔ اس کی شدت اور تڑپ کو منٹو ان گنت تشبیہوں کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہے۔

اوپر کی چاروں تشبیہوں میں کوئی نیا پن نہیں۔ لیکن ان فرسودہ تشبیہوں سے منٹو نے بار بار جو کام کیا ہے اس سے عمود۔۔۔ مہر خرم۔۔۔

منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچنے اور مفاہیم کرنے کی جو خدمت لی اس کی چند اور تصویریں دیکھیے۔ پہلی دو تصویریں ”دھواں“ کی ہیں۔

”موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو بڑے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے“

(دھواں)

”ایک کبوتر اور کبوتری پاس پاس پر پھلاٹے بیٹھے تھے
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم سچت کی ہوئی ہڈیا کی
طرح گرم ہیں۔“

(دھواں)

”وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بندی سے ریشمی کپڑے
کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے“

(مصری کی ڈلی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے
گوشتوں میں سے نکال کر منظر عام پر لاتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش
بنانے میں مدد دیتا ہے۔

”یہ اسٹوک کار بھی عجیب چیز ہے پردے پر عشق کرتا ہے تو“

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسٹریٹل پی رہا ہے۔“

(سجدہ)

”اپنے آپ کو چھپانے کی پھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا
بے جان لطیف بن کر رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا
گیا ہو۔“

(سجدہ)

”وہ کرسی پر اس انداز میں اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا
مہرہ لباط سے بہت دور پڑا ہے۔“

(سجدہ)

”اس کی شرارت اب دم کئی گلہری بن کر رہ گئی تھی۔“

(سجدہ)

”نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جیسے اکھاڑے میں کوئی
نامور پہلوان اپنے نئے مد مقابل کی طرف غم ٹھونک کر بڑھتا
ہے۔“

(نیا سال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے کر اسے ایک

ایسی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں، جس کا ہر رنگ تیکھا اور ہر نقش واضح ہے۔
 منٹو کی تشبیہوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی تڑپ اور تیزی سے
 خالی نہیں ہر تشبیہ کے پیچھے ایک مکمل اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے منٹو کی فنی چابکدستی
 اس طرح بر محل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا تاثر قبول کرتا ہے اور وہی
 ذہنی اور جذباتی نتائج اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں نہیں۔

منٹو کا اسلوب اظہار جس میں الفاظ، فقرات اور تشبیہوں کو یکساں اہمیت ہے مکمل
 تاثر کی تخلیق کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔ اور شاید بہت کم موقع ایسے ہیں جن پر اسے
 اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔

اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو بھی دخل حاصل ہے۔
 اور وہ ہے 'تکرار'۔

'تکرار'، مشرقی اسلوب اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم
 میں برتا گیا ہے لیکن اردو اور فارسی میں عموماً 'تکرار' کو ایک لفظی صنعت کے طور پر
 استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے لکھنے والوں نے عموماً صوتی ترم اور تاثر
 انگریزی کا کام لیا ہے۔

گو کبھی کبھی یہ تاثر محض صوتی ترم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیت کے اظہار کا وسیلہ
 بھی بنتا ہے۔

نثر میں مغربی اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقرات کی تکرار خاصی عام ہو گئی

ہے۔

چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن کسی افسانہ نگار نے اظہار کے وسیلہ کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا۔

جیسے منٹو نے۔ منٹو کے مشہور افسانوں میں سے ’خوشیا‘، ’لغز‘، ’بلاؤز‘، ’ہٹک‘، ’نیا قانون‘ اور نسبتاً کم معروف افسانوں میں ’الو کا پٹھا‘ اور ’قبض‘ اس فن کے بڑے کامیاب مظہر ہیں۔

’لغز‘ میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالا خانے سے نیچے اُترتا تو افسانہ نگار کے لفظوں میں :-

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتویں منزلیں اس کے کانڈھول پر دھردی گئی ہیں۔“

اس لیے کہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہ کرنے کی منزا میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں اور وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سمائی جا رہی تھیں۔

ان گالیوں سے کیشو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ منٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبانی سنیں :-

”_____ مالک مکان نے غصے میں آکر اس کو گالی

دی۔ _____ گالی۔ _____ یوں سمجھئے کہ کوڑا لگے

راستے پگھلا ہوا سیسہ شاہیں شاہیں کرتا اس کے دل میں اُتر •
 گیا اور اس کے سینے کے اندر جو بلڑ مچ گیا اس کا تو کچھ ٹھکانہ ہی
 نہ تھا۔“

”اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا
 تھا، سیٹھ کے جھروں بھرے چہرے پر تے کر دے مگر وہ اس
 خیال سے باز آ گیا کہ اس کا سزاوار تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔“

”سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی موٹی جتنی اس کی چربی بھری
 گردن تھی۔ اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اُوپر سے اس پر کوڑا
 کرکٹ پھینک دیا ہے۔“

”ایک نہیں دو گالیاں — بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے
 بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں اس کے
 کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنا شروع کر دیتی
 تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔“

• چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکڑ ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کپل دیا گیا ہے، چاؤں، کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے۔
 — گالی — گالی ٹھیک اس طرح اس سے اُلجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھڑبیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا دھرتی کو شش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا ہے اتنی ہی زیادہ زخمی ہوتی جا رہی تھی۔“

”سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا — دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو —
 پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلنے دیکھا، جیسے دو بڑے بڑے چرے مور یوں سے باہر نکلے ہوں۔“

”جب اس کے سامنے ایک نوڑنے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔“

”گالیاں — گالیاں — کہاں تھیں وہ
گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کراپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر
وہ ان دو پتھروں کو جو کسی چیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے
اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے۔“

”اس نئے باغ میں آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں
اس کے سارے پرانے اور نئے خیالی ایک بار کی صورت میں
گنڈھ گئے دو مہینے کا کراہ، اس پتھر کی بلڈنگ میں درخواست
لے کر بانا — سات منزلوں کے ایک سو بارہ
زیسے، سیٹھ کی مہدی آواز، اس کے سر پر مسکراتا ہوا بجلی
کابل اور — یہ موٹی گالی — پھر
دوسری اور اس کی خاموشی — یہاں پہنچ کر آگ
کے اس چکر میں تڑتڑاگولیاں ہی نکلتا شروع ہو جاتی ہیں اور
اسے الیا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چیلنی ہو گیا۔“

”لغزہ“ میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے منٹو نے آہستہ آہستہ کیشو لال کے ذہنی
اور جذباتی ہیجان کو واضح کرنے میں مدد دل ہے۔ اور اس تکرار اور بڑھتے ہوئے ہیجان

مین مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیشو لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ بن گیا۔ جس سے کیشو لال کے دل کو ضرور تسکین مل گئی۔ لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا۔ کہ ”لگتا ہے“

منٹو اپنے فن میں افسانہ کی بہتید، اس کی اٹھان، اس کے نقطہ عروج اور اس کا انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے غلوں اور اہٹاک سے ربط اور تسط کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں، وہ نعرہ، میں گالیوں کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔

تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے۔ تکرار ہی نے افسانہ کو آہستہ آہستہ اٹھان کی طرف لے جا کر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے۔ اور تکرار ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو قاری کے نقطہ نظر سے اس کا مقصود ہے۔

”بلا کوز“ شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس جنسہ بیداری کی کہانی ہے۔ جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منٹو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر تصورات کی تکرار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ ایک دن مومن

”شکیکہ کی سفید بفل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آگیا — یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔“

مومن کے دل میں اس کے بعد دھندلے دھندلے خیالات پیدا ہوتے رہے۔ لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹرنک کھول کر اپنے عید کے لیے بنے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو:-

”رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا پھندا آ گیا اور پھندا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیکہ کی بفل میں دیکھا تھا۔“

اور پھر کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے سائٹن کی چمکیلی کسٹرنی اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے:-

”حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دہاتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکیکہ

کی وہی بنی تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا
گچھا دیکھا تھا۔“

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤں کو دیکھتا تو۔

”اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے
شکیلہ کی بنی میں دیکھے تھے اور بالآخر ایک رات کو“
”جب وہ سویا تو اس نے کئی اُدٹ پٹانگ خواب دیکھے ڈپٹی
صاحب نے پتھر کے کونلوں کا ایک بڑا ڈھیر اس سے کوٹنے
کو کہا۔“

جب اس نے ایک کونڈ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی
ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی
کھانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولہ بنا ہوا تھا۔ پھر یہ
گولے کاتے رنگ کے غبار سے بن کر ہوا میں اڑنے شروع
ہوئے۔ بہت اُوپر جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آندھی آگئی اور
مومن کی رومی ٹوپی کا پھندا کہیں غائب ہو گیا۔ پھندے کی
تلاش میں نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا ایک
کالی ساٹن کے بلاؤں پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی

دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ماتھ پھیرتا رہا پھر دفعتاً بڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقاء، اس کے منتہا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منٹو نے ایک خاص لقوٰر کی تکرار کو فن کی بنیاد بنایا ہے افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے جو مراحل طے کئے ہیں۔ ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے۔

لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے لقوٰرات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔

فکر کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنے لیے یہ امتیاز مخصوص کیا ہے کہ جب کسی خاص محل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس محل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔

’لغز‘ اور ’بلاؤز‘ کی مثالوں سے منٹو کے فن میں تکرار کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے دہشک، ’خوشیا‘، ’اٹو کا پٹھا‘ اور ’قبن جیے‘ افسانوں میں بھی اُجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو نے ’تکرار‘ کی طرح ’تضاد‘ کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ ہماری سیاسی،

مباشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدروں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشے اور تئو لیس کی نظر سے دیکھا اور اپنے افانوں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

سماج کے مختلف طبقوں میں اُونچے نیچے اور معاشرتی و معاشی کشمکش، زندگی کے متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر و باطن میں بدیہی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔

منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسان کو فریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و مسرت کی بربادی کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوب و اداسے جس میں لفظ، فقرے اور افانے کے مختلف اجزاء مل جل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں، بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

پہلا اقتباس 'نفرہ' کا ہے۔ جس میں کینولال کے جذبات کی مصوری میں تعورات کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی اُونچے نیچے کا پیدا کیا ہوا ہے :-

”اس گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے

..... لگد کیڑے۔ از کما منٹوں میر

اسی طبقاتی تضاد کی ایک شکل 'بلاؤز' میں اس طرح دکھائی دیتی ہے :-
 "———— نوکروں کے متعلق کون غور کرنا ہے۔ ہم بچپن سے لے کر
 بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور اس پاس کے
 آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔"

دو کردار ایک ہی صورت حال کو اپنے اپنے جذبات اور تقویٰ کی روشنی میں کس
 کس رنگ میں دیکھتے ہیں، اس کا اظہار 'ہنگ'، 'میں کئی جگہ' مادھو اور سوگندھی کے جذبات
 کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے ان کئی تقویروں میں سے ایک یہ ہے :-

"ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اُتار
 دی اور دوسرا ہاتھ اس فرم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو
 کا فوٹو چڑھا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا۔ جیسے ہاتھ اس کی طرف
 بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کی سمیت سوگندھی کے ہاتھ
 میں تھا۔"

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم
 ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں
 سے جب فریم زمین پر گرے۔ اسے اسخ ٹوٹنے کی آواز آئی

مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔

آخری جملہ میں مادھو نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک پُر فریب جھوٹ کی شکلی اختیار کر ہے۔ اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھیے:-

”_____ مادھو ڈر گیا۔ وہ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے

کے لیے جھکا تو سوگندی کی گرنج سنائی دی۔ خبردار۔ پُری رہنے

دے دیں _____ تو جا، تیرے پونا پیچھے ہی میں اس

کو منی آرڈر کر دوں گا۔“

سوگندی کے اس تلخ طنز بھرے جملے میں کئی تضاد ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں ایک تضاد تو یہ ہے جو سوگندی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سوگندی کا ایک ایک لفظ ڈوبا ہوا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس مفہوم سے ظاہر ہے جو گزرے ہوئے واقعات اور موجودہ صورت حال میں تضاد مبنی کر رونما ہوا ہے۔

’ہٹک‘ کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فنکارانہ تصویر

ہے:-

”بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سو توجہ بچار کے بعد

بھی جب اس کو اپنا دل پر چاٹنے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس
نے اپنے خارش زدہ کتے کی گود میں اٹھایا اور ساگوں کے
چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔“

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر منٹو کو جو قدرت
حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے افانوں میں یہ تضاد یعنی دوسری لفظی اور معنوی صوفیوں
میں بھی رُو نما ہوتا ہے۔

ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اب تک جو بہت سی مثالیں
پیش کی گئیں۔ ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ چمکتے دکھائی دیتے ہیں مثلاً ’دغزہ‘ کے
پورے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کے اندر کی زندگی کا تضاد اور دو
مختلف آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو متضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح نمایاں
ہے۔

اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں منٹو کی بھی ہونی وہ بات اب
بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے ماسٹر نثار تک ہر انسان نے محبت کی
ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے
ہے۔ جنہیں ہم مینیک کے مبادیات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف
زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال

اس کے تاثرات و مقورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے۔

وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے، تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص عمل کی ضروریات کے مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔

ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگاران مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ براہوئے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد انداز فکر کی بنا پر جزئیات نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے۔ چنانچہ اس خاص نقطہ نظر سے منٹو کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔

منٹو نے ہمیشہ کسی واقعہ یا کردار کے تاثرات و نقوش کی وضاحت کے لیے ایسی

جزئیات کو زیادہ اہمیت دی ہے جنہیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ منٹو جس طرح بیان و اظہار خیال کے معاملہ میں اور اپنے مقورات کی وضاحت کے لیے تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انہوں نے بظاہر غیر اہم و معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ واقع کی ہو یا کردار کی انہیں معمولی رنگوں سے شوخ اور تیکھا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں

دیکھیے :-

”مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوئی کی دوکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور منچوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا ”ہت بیری ایسی کی مٹی“

یہ اُستاد منگو ہیں نیا قانون، میں۔ اسی افسانے میں انہی کی دو تصویریں اور ملاحظہ

ہوں :-

”چھاؤنی پہنچ کر منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سدکایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا“

گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ بٹھرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھ ہوئے گورے سے پوچھا :-
”صاحب بہادر! کہاں جانا مانگتا ہے؟“

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو دم ہی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔“

اپنی چھوٹی چھوٹی جڑ بیات سے میں استاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملا ہے۔ ”بچاٹا“ میں گوبال کے پتاجی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے:-

”اس کو اپنے پتاجی کی ڈانٹ ابھی طرح یاد تھی۔ اس کے پتاجی لالہ ہر شوقم داس تھانے دارنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گئی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کارس چوس رہے تھے“

”پہچان“ میں کچھ شب زندہ داروں نے جن کمروں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے:-

”کوٹنے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا۔ جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی چادر بچھی ہوئی تھی، تیکہ بھی بڑا تھا جس پر سرخ رنگ کے بھول کرٹھے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کے کارنس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال چھنے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک نکالی گرگانی رکھی تھی“

”کپڑے اس کے غصہ مالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے کوٹ

کی آستینوں کے آخری سقمے کثرت استعمال سے گھس گئے تھے اور بھوڑے
نکل آئے تھے، کالر کھلا تھا اور قمیض میں ایک اور دھلائی کی مار تھی“
(بابخ)

”بادرچی خانہ میں گرم مصالحہ کو متے وقت جب لوہے سے لوٹا لڑاتا
اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے
پیروں کو ہلرز نشی بہت بھلی معلوم ہوتی“

(بلاؤنز)

”وہ سا گوانے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی
اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں۔ پلنگ کی کانپ کی
طرح پھیلی ہوئی تھیں، جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے
کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں ٹشمن آلود گوشت
اُبھلا ہوا تھا۔ جو بار بار مونڈھنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا
تھا، جیسے سچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے“
(پلنگ)

یہ منٹو کی جزئیات نگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو
نے کسی واقع کی مصوری کرنے، کسی ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری
ہیئت اور باطنی کیفیات بنانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں۔ ان میں کبھی چھوٹی چیز اور
چھوٹی بات کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔

منٹو فنکار تھا اور فنکار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی۔ دوسروں کو حقیر اور معمولی نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں۔ بشرطیکہ فنکار انہیں صحیح انداز سے اور محل برتنے پر قادر ہو اور یہ قدرت منٹو میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انہیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظروں میں محترم بھی۔ جزئیات کی قدر پہچاننے، انہیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے منٹو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو، جن میں افسانہ کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوب نگارش کی ساری خصوصیتیں شامل ہیں۔ یعنی تشبیہ، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقرات کی تکرار اور ان کے استعمال میں تضاد کا صرف اس کی شخصیت، مزاج اور انداز نظر سے متاثر ہوئے ہیں۔

منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے اور سوچتا ہے اسے بغیر جھجک، خوف اور اندیشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں اس کے جدت پسند مزاج اور توانا شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق، معاشرہ اور فردان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بین اور نقطہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچائی برائی اور عیب و نہر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی و انفرادی زندگی

کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و سنہر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجربہ کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ "انسان نے انسان کے ساتھ سخت نا انصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ نا انصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون نا انصافی کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے۔

منٹو نے اس نا انصافی کو مٹانے اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو اپنے فن کا مقصد بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بے حلیم کام کا بیڑہ اٹھانا بجا نئے خود ایک مہم ہے لیکن اس سے سخت تر مہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔

منٹو کی مخصوص نظر نے انہیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساس درد نے انہیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ہر نا انصافی کرنے والا سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رُخ سے قریب اور طلسم کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو رُسا کرتا ہے اس لئے اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا نڈر، اتنا بے خوف اور جبری ہونا چاہیے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لیے سینہ سپر رہے۔

منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے غوثی، یہ جرات اور یہ مردانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر وار کو دلیری سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبعی سے جھیل لے۔

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اچھا بھی اور بُرا بھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی خرابیوں کا تجزیہ کر کے انہیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے چوٹ کھانے والا قلم اکر رہ جائے، انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور بُرا اس طرح کہ حیاتِ انسانی کے بعض مستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی دردیدہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے ماسوروں کی نمائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاری سے دنیا والوں کو صرف عریانی سکھائی ہے۔ یوں اس بُرے پہلو کا ایک اچھا پہلو یہی ہے اور اس کی تاویل یہی کہہ کر کی جاسکتی ہے کہ یہ سب کچھ منٹو کا مزاج تھا۔ اس کی شخصیت تھی اور منٹو فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن پر اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں جنہوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پہلو نمایاں کئے ہیں۔ سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، معاشی کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔

منٹو نے اپنی زبردست قوتِ ارادی سے ہر طرح کے انتشار و کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کرنے والے حالات کا مقابلہ بڑی دلیری اور جوا مردی سے کیا۔ دیکھئے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے لئے فتح کی راہ نکالی۔ اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں نے بُرے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفان، انتشار اور کشمکشوں کی ٹکراؤ اور ریلے سے اس کے پیروں کو ڈگمگاتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار گزار سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض منزلوں میں

اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آمادہ پایا ہے۔ شکست کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر برا اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لیے کسی آپ زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشمکش اور غارجی ماحول اور بیرونی زندگی کے اس تقادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آتی ہے۔ اور منٹو کی شخصیت کی عظمت اور نمایاں ہوئی ہے۔ لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور پسپا بنانے کا پیش خیمہ بنی ہے۔ منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیات فن کے ہر دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے تواتر کی جھلک نمایاں ہے کہ منٹو نے مدتوں کچھ نہیں لکھا۔

کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح تواتر اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا۔ مثلاً منٹو کے مجموعے ”ٹھنڈا گوشت“ کے سب افسانے (سوائے ٹھنڈا گوشت کے) ۲۳ اور ۳ جولائی ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔

”بادشاہت کا خاتمہ“ (مجموعہ) کے سب افسانے یکم جون ۱۹۵۱ء اور چودہ جون ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح ”یزید“ (مجموعہ) کے سب افسانے چار اکتوبر ۱۹۵۱ء اور پندرہ نومبر ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔

منٹو کے آخری دور کے بعض مجموعے جو زیر ترتیب اور زیر اشاعت نہیں۔ منٹو

کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور ان افسانوں کو بڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر تین باتیں محسوس کرتا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے منٹو کے کم تر درجے کے افسانے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن انحطاط کی منزلوں سے گذر رہا ہے چننا اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنہیں ہم مجموعی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے جابجا منٹو کی ذہانت ان کی حدت پسندی، ان کی شوخی طبع، ان کی گہری طنز اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

منٹو کی قادر الکلامی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں اس دور میں بھی اسی تازگی اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے۔ بہت اچھے اور بُرے سب افسانے دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔

منٹو کو فطرت نے ایک قصہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی اور جب اس نے مجبور اور بے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے محاسن کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کئی گز کی باتیں معلوم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ اس کے فطری میدان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان گز کی باتوں

سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔

منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے ہر انسان اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا موزوں اور دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے اور بغا ہر بہت معمولی ہونے کے باوجود یہ شرط فقہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرنا چاہتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں انتہائی یگانگت اور بے تکلفی کا رشتہ قائم ہو جائے۔

پڑھنے یا سننے والا یہ محسوس کر سکے کہ فقہ گو اسے اپنا ہمارا سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تامل نہیں کرے گا۔ وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔

کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو قالب ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح کہنا کہ جیسے وہ بے حد اہم ہے، کہانی کہنے والے کی بڑی حیثیت ہے۔

منٹو فقہ گوئی کے میدان میں یہ حیثیت حاصل کرنے میں ماہر تھا۔ وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح باتیں کرنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا۔

کہ دوسرے اس کے جھوٹے کو، اس کے پُر فریب تخیل کو، اس ذہانت کی آغوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب تصور کو سچ سمجھ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کسی طرح کہانی بن سکتی ہے اس کی مثال منٹو کا ”انسان“ ”چوبیس دان“ ہے۔ کہانی میں کس طرح باتوں کا مزہ پیدا کر کے اپنے پڑھنے والے کے احساسات میں مکمل مطابقت

پیدا کی جاسکتی ہے۔

اس کا اندازہ 'چند'، 'مس ٹین والا'، 'میرا نام رادھا ہے'، 'ٹوٹو'، 'نگلی آوازیں'، حامد کا سمیچہ، رحمت خداوندی کے پھول، خورشٹ، باسط، ٹیٹوال کا کتا، چور، نکلی، اور والد صاحب کے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کسی طرح عجیب و غریب اور ناقابل اظہار خیال افسانوں میں جگہ پا کر اور منٹو کی چابکدستی کے حلقہ بگوش بن کر پڑھنے والوں کا دل موہ سکتے ہیں۔ یہ 'پیرن' صاحب کرامات، بادشاہت کا خاتمہ، کتے کی دُعا اور 'عزت کے لیے' جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

منٹو اپنے قریبی ماحول میں سے اتنی آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنجیدہ مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ منٹو کہانی جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی فنی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دور اسقاط میں بھی وہ کہانی کہنا بھولا نہیں تھا۔ اسی لئے اس اسقاط کے زمانے میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

بہی ساری باتیں ہیں جو مل جل کر منٹو کے فن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور انفرادیت اور عظمت بھی۔ لیکن منٹو میں اگر اسکنڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ اور گرما گرمی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگر چوں کہ دینے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتا وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہر میں سمجھے ہوئے تیروں کی طرح برتنے اور دوسروں کو کچھ کے دے کر اس میں لذت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور صبریہ

کو لفظیات کی نازک حدود میں رکھنے کے سبائے اسے کوچہ و بازار میں رسوا کرنے سے پرہیز کر سکتا تو منٹو یقیناً اس سے بھی بڑا فنکار ہوتا۔ جیسا کہ وہ اب تھا۔

اس لئے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ ان چند کمزوریوں کے باوجود بہت بڑا فنکار تھا اس کے مشاہدہ، تخیل، تصور، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا گہرا رنگ ہے اور شخصیت میں عین معمولی قوت و توانائی، وہی قوت و توانائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے۔ اور آنے والے ہر دور میں ہر طرح کے حوادث کے خلاف سپر بن کر اس کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی۔ منٹو مر گیا ————— لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔

اتار کلی

نام اُس کا سلیم تھا مگر اس کے یار دوست اُسے شہزادہ سلیم کہتے تھے غالباً اس لیے کہ اس کے خدو خال مغلی تھے خوبصورت تھا۔ چال دُحال سے رعونت ٹیکتی تھی۔ اُس کا باپ پی ڈبلیو ڈی کے دفتر میں ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ دو سو روپے ہوگی مگر بڑے ٹھاٹ سے رہتا ظاہر ہے کہ رشوت کھاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا۔ جیب خرچ بھی اُس کو کافی ملتا تھا اس لیے کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بہت بن ٹھن کے رہتا۔ اُس کے پاس کئی سوٹ کئی قمیضیں تھیں جو وہ بدل بدل کے پہنتا۔ شوکم از کم بیس کے قریب ہوں جب کالج میں تھا۔ تو کئی لڑکیاں اُس پر جان چھڑکتی تھیں۔ مگر وہ بے اعتنائی برتا۔ آخر اس کی آنکھ ایک شاخ و شنگ لڑکی جس کا نام سیما تھا اس سے پڑ گئی۔

سلیم نے اس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اس کا التفات حاصل کر لے گا۔ نہیں وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ سیما اس کے قدموں میں گر پڑے گی اور اس کی منوں و منکر ہوگی کہ اس نے محبت کی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

ایک دن کالج میں سلیم نے سیما سے پہلی بار مخاطب ہو کر کہا۔
آپ کتابوں کا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئی ہیں۔

لایئے مجھے دے دیجئے ————— میرا تانگہ باہر موجود ہے۔ آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھرتک پہنچا دوں گا۔

سیما نے اپنی بھاری جھرمک کتابیں بغل میں دابتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا۔

آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ————— بہر حال شکریہ ادا کئے دیتی ہوں۔

شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا۔ چند لحاظ سے لیے وہ اپنی خفت مٹاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سیما سے کہا۔

عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ————— مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا ؟
سیما کا لہجہ اور زیادہ خشک ہو گیا۔

عورتوں کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوگی ————— مگر فی الحال

مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ آپ کی پیش کش کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں۔ اس سے زیادہ آپ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر سیما چلی گئی۔ شہزادہ سلیم جو انارکلی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں جھپکتا رہ گیا۔ اس نے بہت بُری طرح شکست کھائی تھی۔ اس سے قبل اس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آچکی تھیں۔ جو اس کی آبرو کے اشارے پر چلتی تھیں۔ مگر یہ سیما کیا سمجھتی ہے اپنے کو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت ہے جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں اُن میں سب سے زیادہ حسین ہے مگر مجھے ٹھکرا دینا یہ بہت بُری زیادتی ہے۔ میں ضرور اس سے بدلہ لوں گا۔ ————— چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

شہزادہ سلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی اسکیمیں بنائیں مگر بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ وہ یہ جرم کر بیٹھا مگر اسے سیما کے چہرے پر یہ ناک بہت پسند تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا متور بھی ایسی ناک کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

سلیم تو اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوا۔ مگر تقدیر نے اس کی مدد کی اس کی والدہ نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ نگاہِ انتخاب آخر سیما پر پڑی جو اس کی سہیلی کی سہیلی کی لڑکی تھی۔

بات پختہ ہو گئی مگر سلیم نے انکار کر دیا اس پر اُس کے والدین بہت ناراض

ہوئے گھر میں دس بارہ روز تک ہنگامہ مچا رہا۔

سلیم کے والدین اس سخت طبیعت کے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا۔

دیکھو تمہیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔ سلیم بہت دھرم تھا جواب میں یہ کہا۔

آپ کا فیصلہ کوئی مائی کورٹ کا فیصلہ نہیں۔ پھر میں نے کیا جرم

کیا ہے جس کا آپ فیصلہ سنارہے ہیں۔ اس کے والد کو طیش آگیا۔ تمہارا یہ جرم ہے کہ تم ناخلف ہو۔ اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ مدول حکمی کرتے ہو۔ میں تمہیں عاق کر دوں گا۔

سلیم کا جوش تھوڑا سا ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن آبا جاجان شادی میری مرضی کے مطابق تو ہونی چاہیئے۔ بتاؤ تمہاری مرضی کیا ہے۔

اگر آپ ٹھنڈے دل سے سنیں تو عرض کروں۔

میرا دل کافی ٹھنڈا ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ ڈالو۔

میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔

سلیم نے رُک رُک کر کہا مجھے۔ مجھے۔ ایک۔

لڑکی سے محبت ہے۔

اُس کا باپ اگر جا کس لڑکی سے؟

سلیم تھوڑی دیر چپکچپا یا ایک لڑکی ہے۔

کون ہے وہ۔ کیا نام ہے اس کا؟

سیما ————— میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔

میاں افتخار الدین کی لڑکی؟

جی ہاں اس کا نام سیما افتخار ہے میاں خیال ہے وہی ہے۔

اس کے والد بے تحاشا بننے لگے ————— تمہاری شادی اس

لڑکی سے قرار پائی ہے ————— کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟

سلیم بوکھلا سا گیا ————— یہ سلسلہ کیسے ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں

آتا تھا۔ کہیں اس کا باپ بھوٹ تو نہیں بول رہا تھا؟

سلیم سے جو سوال کیا گیا تھا اس کا جواب اس کے والد کو نہیں ملا تھا چنانچہ

انہوں نے کڑک کر پوچھا۔

سلیم مجھے بتاؤ کیا سیما تمہیں پسند کرتی ہے؟

سلیم نے کہا جی نہیں۔

تم نے یہ کیسے جانا؟

اس سے ————— اس سے ایک بار میں نے معمر الفاظ میں

محبت کا اظہار کیا ————— لیکن اس نے مجھے ————— تمہیں

درخور اعتنائہ سمجھا۔

جی ہاں ————— بڑی بے رُخی برتی۔

سلیم کے والد نے اپنے گننے سر کو تھوڑی دیر کے لیے کھجلیا اور کہا تو پھر

ہوتے ہیں۔ جو مرد کے جذبات کے پھولوں پر ٹپکتے ہیں۔ جن سے اسے راحت ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔ رات کے دس بجے دولہن کو جملہ عروسی میں داخل کر دیا گیا۔

سلیم کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ اس کمرے میں جاسکتا ہے۔ لڑکیوں کی چھڑچھاڑ اور رسم و رسوم سب ختم ہو گئی تھیں وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ پھولوں سے سجی ہوئی مسہری پر دولہن گھونگھٹ کاڑھے رشیم کی گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔

شہزادہ سلیم نے خاص اہتمام کر لیا تھا کہ پھول انار کی کلیاں ہوں وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسہری کی طرف بڑھا اور دولہن کے پاس بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک وہ اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی بغل میں کتابیں ہوں گی۔ جن کو وہ اٹھانے نہیں دے گی۔

آخر اس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اس سے کہا سیما۔ یہ نام لیتے ہی اس کی زبان خشک ہو گئی۔ لیکن اُس نے پھر جرأت فرمایم کی اور اپنی دولہن کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دیا اور بھونچا رہ گیا۔ یہ سیما نہیں تھی کوئی اور ہی لڑکی تھی۔ انار کی ساری کلیاں اس کو ایسا محسوس ہوا کہ مڑجھا گئی ہیں۔

تعلیم

تالیوں کے شور میں پرنسپل اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور طلباء اور طالبات سے مخاطب ہوتا ہے یہ رسم جب سے میں اس کالج میں پرنسپل مقرر ہوا ہوں ہر سال باقاعدہ ادا کی جاتی ہے ہر سال اس موقع پر تالیوں کے شور کے ساتھ میں اپنی کرسی سے اٹھتا ہوں اور قریب قریب وہی تقریر کرتا ہوں۔ جو میں نے آج سے دس سال پہلے کی تھی۔ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں وہی جذبات پیدا ہوتے ہیں جو اس سلسلے کے آغاز میں ہوئے تھے۔ آج جب میں نے غور کیا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پوسٹ ماسٹر ہوں اور کالج کی یہ بلڈنگ بہت بڑا ڈاک خانہ۔ تم سب خطوط ہو جو کچھ دیر اس بلڈنگ میں رہ کر اپنے اپنے ٹھکانے پہنچا دیئے جاتے ہو۔ تم میں سے کچھ بیرنگ ہو جاتے ہیں جس کے باعث تمہارے والدین کو حیرانہ ادا کرنا پڑتا ہے کچھ غلط ایڈیٹر

جیسا کہ دھڑا دھڑا بھگتے رہتے ہیں۔ بہر حال پکھیل ہے بہت دلچسپ
 ہر سال امتحانوں کا ایک چکر شروع ہوتا ہے۔ حسرت اور غم کی ملی جلی
 ہیں کچھ کامیاب ہوتے ہیں کچھ ناکام۔

ان میں کچھ کامیاب ہوتے ہیں اس وقت میرے سامنے ایسے کئی چہرے
 لہریں میں ہر سال دیکھتا ہوں اس وقت میرے سامنے ایسے کئی چہرے ہیں۔
 ہیں جو کامیابی کے باعث تمنا رہے ہیں۔ خزاں اور بہار کا یہ ملا جلا موسم ہر سال
 اس کے ساتھ ساتھ میں چننا لیے چہرے ہیں۔ خزاں اور بہار کے جوئی اے کا
 صدے سے مڑ جھائے ہوئے ہیں۔ وہ لڑکیاں اور لڑکے کے لیے کسی بڑے کالج
 آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ یا تو ادنیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی بڑے کالج
 امتحان پاس کر چکے ہیں یا تو ادنیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی بڑے کالج
 میں داخل ہو جائیں گے یا تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے دنیوی کاموں میں مصروف ہو
 جائیں گے وہ جو اس امتحان کی دیوار نہیں چاند سکے دوبارہ کوشش کریں گے جو
 یہاں سے جا رہے ہیں۔ ان کو میں الوداع کہتا ہوں اور ان کی کامیابیوں
 کے لیے دعا کرتا ہوں۔ جوئے آئے ہیں۔ میں ان کو خوش آمدید کہتا ہوں
 ان کے فائدے کے لیے کہتا ہوں کہ اس تعلیم گاہ میں داخل ہوتے
 ان لوگوں کو ایک نظر دیکھ لیں جو باہر جا رہے ہیں۔ ان سے مجھے پوری پوری ہمدردی
 کے باوجود اپنی کمزوریوں کے باعث یا کسی اور وجہ سے باہر
 کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان سے مجھے پوری پوری ہمدردی۔

پر یغیم سے جو محنت کرنے کے باوجود اس سال بھی ادا نہ ہو سکی۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ خدا کرے آمین۔
 ہو جائے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد جلسہ برخواست ہو جاتا ہے۔
 کالج کی لڑکیوں میں یہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔
 ذکیہ۔ فرخندہ۔ نہیں تو۔
 ذکیہ۔ کیا یغیم مال میں موجود تھی۔

فرخندہ بے چاری غم سے مذحال ہو گئی۔
 ذکیہ ایک بار فیمل ہونے ہی سے آدمی کی کمر لٹ جاتی ہے۔ وہ
 فرخندہ۔ محنت تو بے حد کرتی تھی۔
 ذکیہ۔ اصل میں یہ سب اس کے مزاج کی خرابی کا نتیجہ ہے۔

دو دینے میں کیا مصالحت ہے امتحان شروع ہونے سے دو مہینے
 ادا اس سے کہا یغیم تم میرے گھر آ جایا کرو۔ میں تمہیں
 اداں گی۔ بس یہ سننے ہی جیسے اس کے
 گئی تم اپنے آپ کو بہت وہ سمجھ لگی ہو۔ ہمارے بغیر
 کئی میں تو گدھی ہوں۔ یہ وقت

ہوں۔ اب فرخندہ تم ہی بتاؤ کیا میں نے پھیڑ خانی کے لیے اس کو اپنی مدد پیش کی تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ اکنومکس میں بالکل صفر ہے۔ بس دماغ ہی جو ایسا پایا ہے کوئی ابھی بات بھی کرے تو اُسے بڑی لگتی ہے فرخندہ۔ میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا میں نے کہا دیکھو نعیمة ایسا نہ ہو۔ تمہارا سائیکولوجی کا پرچہ کمزور رہ جائے۔ کہو تو میں اپنے لئے ہوئے نوٹ دے دوں۔ بس یہ سنتے ہی بگڑ گئی۔ کہنے لگی۔ نوٹوں کی اُس کو ضرورت ہوتی ہے جو کتاب سے کچھ نہ سیکھ سکے۔ ویسے بازار میں عام بکتے ہیں۔ کوئی اتنی بڑی رقم خرچ تو نہیں ہوئی۔ بھئی وہ دن اور یہ دن۔ میری زبان جلے جو میں نے پھر اس سے ایسی بات کی ہو۔ جمیلہ۔ کسی کو کیا پڑی ہے جو۔

ذکیہ۔ پڑی وڑھی کی بات نہیں جمیلہ۔ ہمارے دل پتھر کے تو نہیں۔ اس کو دیکھ کر کسے دکھ نہیں ہوتا۔ اور ایسے لمحات میں منہ سے ہمدردی کا کوئی کلمہ نکل ہی جاتا ہے۔

فرخندہ۔ پر اُسے تو ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں۔ کاٹنے کو دوڑتی ہے اگر اس سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہہ دیا جائے۔ ذکیہ۔ جانے اس کے مزاج میں تلخی کہاں سے آگئی ہے۔ جمیلہ۔ اسے تلخی کو چھوڑو۔ سب کو معلوم ہے کہ بے حد مفلس ہے۔

لیکن اگر اس سے کہو نفیمہ تم ہر روز یہ سبز ساڑھی ہی کیوں پہنتی ہو تو بگڑ کر جواب دے گی۔ میرے پاس ایک نہیں۔ ایسی کئی ساڑھیاں ہیں مجھے یہ رنگ پسند ہے۔

فرخندہ۔ سر میں تیل ایسا ڈالتی ہے کہ اس کی بدبو سے ناک پھٹ جاتی ہے اس سے پوچھو تو یہی کہے گی۔ یہ غامس تیل ہے۔ اس سے بال لمبے ہوتے ہیں۔

جمیلہ۔ لمبے بالوں کی بکچی۔

ذکیہ۔ نہیں جمیلہ ایسا نہ کہو۔

اس کا وحشیانہ پن دور ہو جائے تو اس جیسی اچھی سلی تمہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہ ملے۔ لڑکیوں میں یہ باتیں ہو رہی ہیں کہ ایک لڑکا انور اُدھر سے گذرا۔ کافی خوبصورت تھا۔ اس نے سب سے پوچھا کیا باتیں ہو رہی ہیں؟

ذکیہ۔ ہم نفیمہ کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ دوستوں وغیرہ سے مل چکے۔

انور۔ دوستوں وغیرہ سے تو نہیں ملا۔ البتہ نفیمہ سے مل کے آ رہا ہوں۔

فرخندہ۔ کہاں ہے وہ؟

النور۔ باہر باغ میں۔

جمیلہ۔ چلو ذکیہ چلیں۔

النور نہیں اس وقت آپ اس کے پاس نہ جائیں۔ اس کی طبیعت منہموم ہے۔ کسی نے اس کو ذرا بھی جھپٹا تو آفت برپا ہو جائے گی۔

ذکیہ۔ یہ بڑی مصیبت ہے اب اگر کوئی اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہے تو کیا کرے۔

النور۔ بس خاموش رہے۔

ذکیہ۔ کیسے۔

النور۔ بالکل میری طرح۔۔۔۔۔ باغیچے کی طرف میرا گذر ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ پنج پر بیٹھی ہے اور اس کی آنکھوں میں نامکمل آنسو ہیں۔ میرے قدم رک گئے اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف اس کے نامکمل آنسو تکمیل کی آرزو میں تھپاکئے۔۔۔۔۔ اور میں یہاں چلا آیا۔

ذکیہ۔ تو مجھے اس کے پاس نہیں جانا چاہیے؟

النور۔ وہ اس وقت غضب ناک حالت میں ہے ناکامیوں کا اثر

ایسے آدمیوں پر اسی قسم کا ہوتا ہے جنہیں ضرورت سے زیادہ خود پر اعتماد ہوتا ہے دراصل میں کوشش کے باوجود نغمہ کو نہیں سمجھ سکا۔

ذکیہ۔ لیکن کلاس میں اُس سے آپ کا سلوک دلیا ہی تھا جیسے ایک باپ کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔

الوز۔ لیکن اس کے باوجود وہ میری شفقت ٹھکراتی اور میری ہمدردی کو روندتی رہی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لڑکی کا انجام کیا ہوگا۔ تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر دُوبلی لگتی ہے۔ اس کی ہڈیاں باہر نکل آئی ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں ایک دن وہ اپنی زندگی کے پراسرار محاذ پر لڑتی لڑتی تنہا ماری جائے گی۔ یہ کہہ کر الوز ان لڑکیوں سے رخصت لے کر چلا گیا۔
اس کے قدم غیر ارادی طور پر اُسے باغیچے کی طرف لے گئے۔ نغمہ پنج پر پٹی تھی۔ الوز اس کے پاس پہنچا۔

الوز۔ نغمہ — کیا میں تمہارے پاس آسکتا ہوں؟

نغمہ — تمہیں کس نے روکا ہے۔

الوز۔ تم یہاں دیر کی بیٹھی ہو۔

نغمہ۔ کہتے ہو تو اُٹھ کر چلی جاتی ہوں۔

الوز — یہ کیسی باتیں کرتی ہو — میں پوچھتا ہوں تنہائی

میں تم بالکل نہیں گھبراتی ہو۔

نغمہ۔ کیسی تنہائی — میں بالکل تنہا نہیں ہوں۔

الوز۔ ہاں اب تم تنہا نہیں ہو۔

نعیمہ۔ اس سے پہلے بھی نہیں تھی — تم چلے جاؤ گے تو پھر بھی
 تنہا نہیں ہوں گی۔ تم ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے رہے — تم کیا سب کے
 سب — مجھ میں کیا نقص ہے — کیا خرابی ہے جو دوسروں
 کے دل میں خراہ مخاہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے — ہمدردی —
 جاؤ اس ہمدردی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

الوز۔ تم نے رونا شروع کر دیا۔

نعیمہ۔ جھوٹ بولتے ہو تم — میں تو مٹ رہی ہوں —
 تم سمجھتے ہو کہ میں تنہا ہوں بے یار و مددگار ہوں — اسی لئے تم مجھے اپنی
 ہمدردی کے سوکھے ٹکڑے دیتے ہو۔

میں یہ بھیک نہیں چاہتی — جاؤ — جاؤ —
 یہاں سے چلے جاؤ۔

انور محسوس کرتا ہے کہ اگر اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی تو شاید نعیمہ کا
 دماغی توازن نہ بگڑ جائے اس لئے خاموشی سے چلا جاتا ہے نعیمہ پھوٹ پھوٹ کے
 رونا شروع کر دیتی ہے مگر آواز کوئی پیدا نہیں کرتی۔

انور اپنے گھر چلا گیا — وہ اکثر نعیمہ کے بارے میں سوچتا۔ اُس
 نے کئی بار اس کو خط لکھے مگر اس کو اس کا ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ اس لئے
 بھارت دیئے۔

ایک دن وہ باہر برآمدے میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا کہ نوکر ایک خط لایا۔ یہ نغمہ کا تھا۔ جس میں صرف ایک سطر تھی ————— مسٹر انور میں مرنے کے قریب ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔

انور سخت گھبراہٹ میں اٹھا۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی موٹر لی — خط میں ایڈریس موجود تھا وہاں پہنچا۔

اندھیرا اور غلیظ سا کمرہ تھا ————— انور کو کچھ نظر نہ آیا۔
انور۔ نغمہ نغمہ ————— کہاں ہو تم۔

نغمہ ————— ادھر میرے پاس آ جاؤ۔

اب اندھیرے میں انور کو سبائی دینے لگا تھا اس نے دیکھا کہ ایک شکستہ سی چارپائی پر نغمہ کی ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہے۔ انور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

نغمہ۔ تمہیں حیرت ہو رہی ہے اس غلیظ کمرے کو دیکھ کر —————
اسے نہ دیکھو یہاں جس شے کو بھی دیکھو گے تمہیں حیرت ہوگی ————— سبب سے بڑی حیرت انگریز چیز تو ہیں ہوں۔ مجھے دیکھو اور جتنا حیرت زدہ ہو جانا چاہو ہولو۔

انور یہ کیا ہو گیا تمہیں؟

نغمہ۔ انور میری کشتی پاش پاش ہو چکی ہے ————— پینڈے اور پتواروں کے بغیر اسے کئی برس منجھدار میں کھیتی رہی ہوں۔ اب میں اسے اپنے

ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔

الوزر — کیا وہاں اس کی مرمت ہو جائے گی؟ — تم
بولتے کیوں نہیں؟

الوزر میں سن رہا ہوں۔

نعیمہ میں اپنی اس ٹوٹی پھوٹی کشتی کے لیے ادھر ادھر سے چھپڑے اکٹھے
کر کے بادبان بناتی رہی لیکن طوفان نے بڑی بے رحمی سے ان کو چیر بھاڑ دیا۔
الوزر مجھے بتاؤ یہ طوفان اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟
الوزر — طوفان ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں نعیمہ۔

نعیمہ — تم ٹھیک کہتے ہو — میں نے بہت تکلیفیں برداشت
کیں صرف اس لئے کہ بی بی عائشہ کا امتحان پاس کر لوں اور خود کمانے کے قابل ہو
جاؤں — لیکن ان تمام قربانیوں کا انجام تمہارے سامنے ہڈیوں کے
ڈھانچے کی صورت میں پٹا ہے۔

نعیمہ کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ الوزر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا
کہ وہ کیا کرے۔

نعیمہ۔ میں مر رہی ہوں الوزر اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اب ایسا کرنا کہ
میری یہ دو سبز ساڑھیاں جو اسٹول پر پڑی ہیں۔ اور یہ ساری کتابیں اٹھا کر میرے
ساتھ دفن کر دینا۔ ممکن ہے وہاں یہ چیزیں اور بھی زیادہ مہنگی ملیں۔ میں نے

بڑی مصیبتوں سے خریدی تھیں۔ اور دیکھو کسی اور کو میری موت کی خبر نہ ہو —
مجھ سے اب زیادہ بولا نہیں جاتا — میرا خیال ہے مجھے اور بھی کچھ
کہنا تھا۔

الوز نے دیکھا کہ اس پہ حالت نزاع طاری ہے — اُس نے
زار و قطار زونا شروع کر دیا — نعیمہ جس کی آنکھیں مندر ہی تھیں۔ بڑی
مشکل سے کروٹ بدلی اور الوز کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھے اور کہا مجھے
یاد آ گیا ہے۔ جو مجھے تم سے کہنا تھا۔

الوز — کیا کہنا تھا؟

نعیمہ مسکرائی ایک بیوقوفی کی بات ہے — اپنے ہونٹ میرے
مردہ ہونٹوں کے ساتھ لگا دو۔

الوز نے اس کی لقیل کی — نعیمہ کو جو مسرت حاصل ہوئی وہ اس
کی تاب نہ لاسکی اور اپنا آخری سانس اس بوسے کے سپرد کر دیا۔



بدتمیزی

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں۔
جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی

چاہیئے۔

آپ تو بس ہر بات پر گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ آپ نے یہ تو پوچھ لیا ہوتا
کہ میں آپ سے کہنا کیا چاہتی ہوں اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی —
تم بس فقط لڑائی مول لینا چاہتی ہو۔ لڑائی میں مول لینا چاہتی ہوں کہ آپ —
سارے ہمسائے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے لڑتے جھگڑتے
رہتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک برس تک میں نے تم سے کوئی تلخ
بات کی ہے نہ شیریں ————— شیریں بات کرنے کا آپ کو سلیقہ ہی
کہاں آتا ہے ————— نوکر کو آواز دے کر بلائیں گے تو سارے محلے

کو پتہ چل جائے گا کہ آپ اُسے گولی سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔
 میرے پاس بندوق ہی نہیں ————— ویسے میں خرید سکتا ہوں مگر اس
 کو چلائے گا کون میں تو پٹاخنے سے ڈرتا ہوں آپ بنیے نہیں —————
 میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ فراڈ میرے ساتھ نہیں چلے گا آپ کا۔
 اب میں فراڈ بن گیا؟
 آپ ہمیشہ سے فراڈ تھے۔
 یہ فیصلہ آپ نے کن وجوہ پر قائم کیا۔
 آپ جب پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تو کیا آپ نے اپنے آبا جی کے جیب
 سے دو روپے نہیں نکالے تھے؟
 کیوں؟

اس لئے کہ بھنگی کی لڑکی کو ضرورت تھی۔
 بھنگی کی لڑکی سے آپ کی اتنی ہمدردی کیوں تھی؟
 اس لئے کہ وہ بھنگی کی لڑکی تھی ————— بہت بیمار —————
 والد صاحب سے اگر کہا جاتا تو وہ کبھی ایک پیسہ بھی اُسے نہ دیتے —————
 بی نے اسی لئے مناسب سمجھا کہ اُن کے کوٹ سے دو روپے نکال کر
 اس کو دے دوں ————— یہ کوئی گناہ نہیں۔
 جی ہاں ————— بہت بڑا ثواب ہے —————

کیوں؟

اس لئے کہ اس میں تیزابی مادے ہوتے ہیں جو جلد کا ستیاناس کر دیتے
ہیں میری جلد تو آج تک ستیاناس نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ آپ کی جلد بہت
سی نازک ہوگی۔ نازک ہونے کا سوال نہیں۔۔۔ یہ ایک سائنٹفک
حقیقت ہے۔۔۔۔۔“

ہیں سائنٹفک و اینٹفک کچھ نہیں جانتی — بس میں آپ سے
 پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے؟
 بھی نہیں بتا تو چکا ہوں کہ یہ مضر ہے۔
 تو پھر آپ نہاتے کس طرح ہیں۔

ہنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے — پانی ڈالتے گئے اور
ہناتے گئے۔

جسم پر آپ کوئی چیز نہیں ملے۔ ————— میرا مطلب ہے صابن
نہیں تو کوئی اور چیز ملا کر تانوں۔

کیا؟

ببین -

وہ کیا ہوتا ہے۔

ارے بھی چنے کا آٹا۔

آپ کی جو بات ہے زالی ہے میں تو آپ ایسے سکی سے خدا قسم تنگ آگئی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں جاؤں اپنے میکے چلی جاؤں ——— دہاں تمہیں اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔

میں کیوں جاؤں دہاں ——— میں یہیں رہوں گی۔
میں نے تم سے آج ہی کہا ——— اس لیے کہ تم لاکھ مرتبہ مجھے یہ دھکی دیتی رہی ہو کہ میں چلی جاؤں گی اپنے میکے۔
مجھے جب جانا ہو گا چلی جاؤں گی۔

آج تمہاری طبیعت نہیں چاہتی؟
آپ مجھے چڑانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟
میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی ——— اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں تو یقین مانو۔ تم ابھی تانگہ لے کر اسٹیشن پہنچ جاؤ گی۔

کوشش کر کے دیکھ لیجئے ——— میں یہاں سے ایک اپنے نہیں ہوں گی۔
یہ میرا گھر ہے ——— آپ کے باپ دادا کا ہے۔ میرے باپ دادا کا نام مت لیجئے۔ لیکن یہ تو بتائیے ان بے چاروں کا کیا قصور تھا۔ قصور تو سارا میرا ہے۔ لیکن بیگم تم کبھی کبھی اتنا تو غور کر لیا کرو کہ میں نے آخر تمہیں کون سا جانی یا مالی نقصان پہنچایا ہے کہ تم لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔ لٹھ تو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہا ہے ———

میں تو اُسے اٹھا بھی نہیں سکتی۔ تم بڑے سے بڑا گڑاٹھا سکتی ہو۔
 تم ایسی عورتوں میں ہلاکی قوت ہوتی ہے۔ تم عقاب ہو۔
 تمہارے سامنے تو میری حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے۔
 باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے۔ آپ چڑیا ہیں۔ سبحان اللہ
 جب کڑکے اور گر جتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔
 اس شیر کو پہلے ایک نظر دیکھ لو۔
 کیا دیکھوں؟ پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں۔
 یہ خاکسار شیر ہے کیا؟
 شیر ہے مگر خاک میں لپٹا ہوا۔
 اس تعریف کا شکریہ۔ اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کہنا کیا
 چاہتی تھیں تمہاری باتیں تو صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے۔ میں
 کیا سمجھوں گا۔ خدا کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں؟
 خدا اگر بیچ میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔
 بڑے آٹے ہیں آپ خدا کو ماننے والے۔
 خدا کو تو میں ہمیشہ سے مانتا آیا ہوں۔ وہ طاقت جو دنیا
 کنٹرول کرتی ہے۔ کنٹرول تو آپ مجھ پر کرتے آئے ہیں،
 کس قسم کا؟

بہر قسم کا ————— میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی چیز نہیں کر سکی ————— کپڑے لیتا ہوں تو اس میں آپ کی مرضی کو دخل ہوتا ہے کھانے کے بارے میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے آج یہ پکے کل وہ پکے۔

اس میں ہتھیں کیا اعتراض ہے۔

اعتراض کیوں نہیں ————— میرا جی اگر کبھی چاہتا ہے کہ ادھڑی

کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

ادھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے۔

آپ کیا جانیں کتنی مزیدار ہوتی ہے ————— چڑنے میں ڈال کر

اُسے صاف کر لیا جاتا ہے اس کے بعد اچھی طرح گھی میں تلا جاتا ہے اللہ قسم مزا آ جاتا ہے۔

لاحول ولا ————— میں ایسی غلط چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

اور ٹینڈے؟

بکواس ہیں ————— ہنسی کی سب سے بڑی توہین ہیں۔ اُن میں

کوئی رس ہوتا ہے۔

نہ لذت ————— بس فقط ٹینڈے ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں

آتا کہ وہ پیدا کس غرض کے لیے کئے گئے تھے ————— نہایت واہلیات

ہوتے ہیں ————— میں تو اکثر یہ دُعا مانگتا ہوں کہ ان کا وجود سرے سے غائب ہو جائے۔ بڑے بے جان ہوتے ہیں ————— ان کے مقابلے میں کہ وہ بدرجہا بہتر ہے حالانکہ وہ بھی سخت ناپسند ہے۔ آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟ ہر اچھی چیز میں کپڑے ڈالتے ہیں ————— بھنڈی آپ کو پسند نہیں۔ کہ اس میں لیس ہوتی ہے ————— گو بھی آپ کو نہیں بھاتی کہ اس میں یہ نقص نکالا جاتا ہے کہ بدبو ہوتی ہے ————— ٹائٹل آپ کو اچھے نہیں لگتے اس لئے کہ اس کے پھلکے مضم نہیں ہوتے۔

تم ان باتوں کو چھوڑو ————— ٹینڈے کو بھی اور ٹائٹل جائیں جہنم میں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کہنا کیا چاہتی تھیں۔

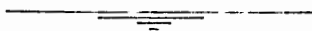
کچھ بھی نہیں ————— بس ایسے ہی آگئی ————— میں نے دیکھا کہ آپ کوئی کام نہیں کر رہے تو آپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ بڑی نوازش ہے آپ کی ————— لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کہنا ہو گا۔ آپ سے اگر کچھ بھی کہہ دیا تو اس کا حاصل کیا ہو گا۔

جو آگے آپ کو حاصل ہوتا رہا ہے اُسی حساب سے آج بھی حاصل ہو جائے گا۔ آپ یہاں سے کچھ حاصل کئے بغیر نہیں گئے کیسے؟ میں آپ سے ایک خاص بات کہنے آئی تھی۔ کیا؟

میں — میں کہنے آئی تھی کہ میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔

آپ کیا سمجھانے آئی تھیں مجھے۔

آپ کو خدا سمجھائے گا — میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پتلون پہن کر اس کے بٹن بالکنی میں بند نہ کیا کریں — ہمایلوں کو سخت اعتراض ہے یہ بہت بڑی بدتمیزی ہے۔



قادر اقصائی

عیدن بالی اُگرے والی چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ماں زہرہ جان نے اس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی بڑی دُور دُور سے رئیس اُس کا مجرا سننے کے لیے آنے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں کھیلتا تھا اُسے محنت ہو گئی اس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا اور اس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ کوئی تین سو روپے کے قریب ہفتے میں تین مرتبہ اس کے پاس آتا اور رات بھر صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور اُگرے کے رہنے والے ہیں۔

ان کا یہ بیان ہے کہ اس کا چاہنے والا ایک بڑھئی تھا۔ مگر وہ اُسے منہ نہیں لگاتی تھی وہ بے چارہ مزدورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا مگر وہ اُسے دھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اس بڑھئی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع مل ہی گیا پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا ————— اس لیے کہ اُس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رعب طاری تھا لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے بعد جرات سے کام لیا اور اُس سے کہا۔

زہرہ جان میں ایک عزیز آدمی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے تمہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری ہر ادائیہ سینکڑوں روپے پنچاؤ کرتے ہیں ————— لیکن تمہیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ عزیز کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے ————— میں تم سے محبت کرتا ہوں ————— معلوم نہیں کیوں۔

زہرہ جان ہنسی۔ اس مہی سے بڑھئی کا دل مجروح ہو گیا۔ تم ہنسی ہو۔ میری محبت کا مذاق اڑاتی ہو۔ اس لیے کہ یہ کنکلی کی محبت ہے جو لکڑیاں چیر کر اپنی روزی کمتا ہے ————— یاد رکھو یہ تمہارے لاکھوں میں کیلئے والے تمہیں وہ محبت اور پیار نہیں دے سکتے جو میرے دل میں تمہارے

لئے موجود ہے۔ زہرہ جان اُکتا گئی۔ اس نے اپنے ایک میراثی کو بلایا اور اس سے کہا کہ بڑھئی کو باہر نکال دو۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔ ایک برس کے بعد عیدین پیدا ہوئی ————— اس کا باپ عبداللہ تھا یا کوئی اور اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیٹھ کے نطفے سے ہے ————— کسی کے نطفے سے بھی ہو مگر ہلاکی خولصورت تھی۔

اُدھر زہرہ جان کی عمر ڈھلتی گئی۔ اُدھر عیدین جوان ہوتی گئی۔ اس کی ماں نے اس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی۔ لڑکی ذہین تھی۔ کئی اُستادوں نے اس نے سبق لئے اور اُن سے داد وصول کی ————— زہرہ جان کی عمر اب چالیس برس کے قریب ہو گئی۔ وہ اب اُس منزل سے گذر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدین کے ہمراہ جی رہی تھی۔ ابھی تک اس نے اس سے مجرا نہیں کرایا تھا وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے۔

عیدین بائی کے حسن کے چرچے عام تھے۔ دُور دور تک عیاش رئیسوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے۔ وہ اپنے اچھٹوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدین کی تعجبی اُتارنے کے لیے اپنی اپنی پیش کش بھیجتے۔

مگر اس کو اتنی جلدی کوئی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ بخشی کی رسم بڑی

دھوم دھام سے ہوا اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے —
اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک تھی سارے شہر میں اس جیسی حسین لڑکی اور
کوئی نہیں تھی۔

اس کے حسن کی غائش کرنے کے لیے وہ ہر عجربت کی شام کو اس کے
ساتھ پیدل باہر سیر کو جاتی۔ عشق پیشہ مرد اس کو دیکھتے تو دل مقام مقام لیتے۔
پھنسی پھنسی چولی میں گذرایا ہوا جو بن سڈول یا نہیں محو دلی انگلیاں جن کے
ناخنوں پر جیتا جیتا ہوا سیا رنگ۔ ٹھمکا سا قد۔ گھنگھریا لے بال قدم قدم پر قیامت
ڈھاتی تھی آخر ایک روز زہرہ جان کی اُمید برآئی۔ ایک نواب عیدن پر الیالٹو
ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی مستی
کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا اور کئی دیگیں پلاؤ اور متعین کی چڑھائی گئیں۔

شام کو نواب اپنی بگھی میں آئے۔ زہرہ جان نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی
نواب صاحب بڑے خوش ہوئے۔ عیدن دُہن بنی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کے
ارشاد کے مطابق اس کا بھرا شروع ہوا۔ پھٹ پڑنے والا شباب تھا جو نحو
نفسہ سرائی تھا۔ عیدن اس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی اس
کی ہر جنبش ہر ادا اس کے گانے کی برسرِ جادو شکن تھی۔ نواب صاحب کا دُ
تیکنے کا سہارا لئے بیٹھے تھے انہوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنت کی میر کر پئے گے
جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے ہنگم سا آدمی

اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بہت گھبرائی یہ وہ بڑھئی تھا اس کا عاشق زار۔ بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب کو جو بہت نفاست پسند تھے ایکایاں آنے لگیں۔ انہوں نے زہرہ جان سے کہا۔ یہ کون بدتمیز ہے۔

بڑھئی مسکرایا حضور میں ان کا عاشق ہوں۔

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ کدڑ ہو گئی۔ زہرہ جان نکالو اس حیوان کو باہر۔ بڑھئی نے اپنے تھیلے سے آری نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کو پکڑ کر اس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی۔ نواب صاحب اور میراثی وہاں سے بھاگ گئے۔ عیدن بے ہوش ہو گئی۔

بڑھئی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور ہوبھری آری اپنے تھیلے میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور قابلِ جرم کر یا ————— کہا جاتا ہے کہ اُسے عمر قید کی سزا ہو گئی تھی۔ عیدن کو اپنی مالِ تنہ کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ دوڑھائی پیٹنے تک بیمار رہی ————— ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ مگر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ چل پھر سکے۔ ہسپتال میں اس کی تیمارداری صرف اس کے استاد اور میراثی ہی کرتے تھے وہ نواب اور رئیس جو اس پر جان پھڑکتے تھے بھولے سے بھی اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے ————— وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی۔

وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی چلی آئی ————— مگر اس کی طبیعت اتنی اُداس تھی کہ کاجی قطعاً مجرا کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس بیس پچیس ہزار روپے کے زیورات تھے جن میں آدھے اس کی مقتول ماں کے تھے۔ وہ انہیں بیچتی رہی اور گزارہ کرتی رہی۔

عورت کو زیور بڑے عزیز ہوتے ہیں۔ اس کو بڑا دکھ ہوتا تھا۔ جب وہ کوئی چوڑی یا نکلےس اونے پونے داموں بیچتی تھی۔

لیکن آخر کیا کرتی۔ اس کاجی ہی نہیں چاہتا تھا کہ راگ رنگ کی مخفیس قائم کرے ان دنوں پاکستان کے قیام کا مطالبہ بڑے زور دل پر تھا۔ آخر ایک دن اعلان ہوا۔ جو عیدن نے اپنے پانچ والورڈ یوسیت پر سنا کہ ہندوستان کے دو حصے ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد منادات شروع ہو گئے۔ ہندو مسلمانوں کو مارنے مسلمان ہندوؤں کو ————— عجب عالم تھا خون پانی سے بھی ارزاں ہو رہا تھا۔

مسلمان دھڑا دھڑ پاکستان جا رہے تھے کہ ان کی جائیں محفوظ رہیں۔ عیدن نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ دہلی نہیں رہے گی۔ لاہور چلی جائے گی۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کئی زیورات بیچ کر وہ لاہور پہنچ گئی۔ لیکن راستے میں اس کی تمام بیش قیمت پشتوازیں اور باقی ماندہ زیور اس کے اپنے مسلمان بھائیوں ہی نے غائب کر دیئے عیب وہ لاہور پہنچی تو وہ لکی میٹھی تھی ————— لیکن اس کا حسن ویسے کا

ولیا تھا۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں للچائی ہوئی آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے بے اعتنائی برتی وہ جب لاہور پہنچی تو اس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہوگی؟

اس کے پاس تو چھپے کھانے کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے۔ لیکن لڑکی ذہین تھی۔ سیدھی اس جگہ پہنچی جہاں اس کی ہم پیشہ رہتی تھیں یہاں اس کی بڑی آدبگت کی گئی۔ ان دنوں لاہور میں ردِ پیہ عام تھا۔ ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا۔ پیرامندی کے وارے پیار سے تھے۔

عیدن کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اُس کو سینکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اس کی آواز جواب دے چکی ہوتی وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی۔ اور دوند سے منہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔

یہ سلسلہ قریب قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا۔ عیدن اس کے بعد ایک علیحدہ کوٹھا کرائے پر لے کر وہاں اٹھ آئی کیونکہ جہاں وہ مقیم تھی۔ اُس نالگہ کو اُسے اپنی آمدن دینا پڑتی تھی۔ جب اس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پر مجرأ کرنا شروع کیا تو اس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اُسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی اس نے کئی زیور بنوائے کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کروائے۔

اسی دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ

کا بادشاہ تھا۔ اس نے کم از کم دو کروڑ روپے کمائے تھے خوبصورت تھا اس کے پاس تین کاریں تھیں۔ پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدن کے صُن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کھلی سفید پیکارڈ اس کے حوالے کر دی۔

اس کے علاوہ ہر شام آتا اور کم از کم دو اڑھائی سو روپے اس کی نذر سزور کرتا ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر سیلی تھی۔ اس نے عیدن سے پوچھا کیا بات ہے آج بہت سی چاندنی اتنی گندی ہے عیدن نے ایک ادا کے ساتھ جواب دیا۔ آج کل لٹھا کہاں ملتا ہے؟

دوسرے دن اس بلیک مارکیٹ بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوا دیئے اس کے تیسرے روز بعد اس نے ڈھائی ہزار روپے دیئے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خرید لے۔

عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ آگرے اور دلی میں تھی تو اُسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا۔ مگر لاہور میں اُسے قادر افسانی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا۔ بغیر ریشے کی ہر بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریشم کی بنی ہو۔

دکان پر اپنا شاگرد بٹھا کہ قادر افسانی سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی پھر رک رہی ہوتی۔ عیدن کے حوالے کر دیتا اُس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ جو عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتی۔

بلیک مارکیٹ کا بادشاہ جس کا نام ظفر شاہ تھا۔ عیدن کے عشق میں بہت

بڑی طرح گرفتار ہو چکا تھا اس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے اگر وہ اُس سے شادی کر لے۔ مگر عیدن نہ مانی۔ ظفر شاہ بہت مایوس ہوا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدن اس کی ہو جائے مگر ہر بار اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مجرے سے فارغ ہو کر رات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کر کے ————— یعنی شراب پی کر پیدل ہی چلا آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سائیں ————— کے تیکے کے باہر عیدن ایک نہایت بدعنوانی کے پاؤں پکڑے التجائیں کر رہی ہے کہ خدا کے لیے مجھ پر نظر کرم کرو۔ میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں ————— تم اتنے ظالم کیوں ہو۔ اور وہ شخص جسے عورت سے دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ قادر اقصائی ہے اُسے دھتکار رہا ہے جا ————— ہم نے آج تک کسی کنجری کو منہ نہیں لگایا ————— مجھے تنگ نہ کیا کہ

قادر اُسے ٹھوکر مارتا رہا اور عیدن اسی میں لذت محسوس کرتی رہی۔

خودکشی

زاہد صرف نام ہی کا زاہد نہیں تھا اس کے زہد و تقویٰ کے سبب قائل تھے اس نے پچیس برس کی عمر میں شادی کی۔ اس زمانے میں اس کے پاس دس ہزار روپے کے قریب تھے شادی پر پانچ ہزار صرف ہو گئے، اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔ زاہد بہت خوش تھا۔ اس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی اس کو اس سے بے پناہ محبت ہو گئی۔ وہ بھی اس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو ماں پر تھی۔ یعنی ویسی ہی حسین بڑی بڑی غلامی آنکھیں ان پر لمبی پلکیں مہین آبرو۔ چھوٹا سالب دہن — اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کئے ہوئے نام پسند نہیں آتے تھے وہ چاہتی تھی کہ خود زاہد نام بتائے۔

زائد دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن اس کے دماغ میں ایسا کوئی موزوں و مناسب نام نہ آیا۔ جو وہ اپنی بیٹی کے لیے منتخب کرتا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا اتنی جلدی کیا ہے نام رکھ لیا جائے گا۔ بیوی مسموعی کہ نام ضرور رکھا جائے میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی وہ کہتا اس میں کیا حرج ہے — جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس گل کو تھنی کے ساتھ ٹانگ دیں گے پھر میں اسے کیا کہہ کر پکاروں؟ — مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

فی الحال بیٹا کہہ دینا کافی ہے۔

یہ کافی نہیں ہے — میری بیٹا کا کوئی نام ہونا چاہیے۔
تم خود ہی کوئی منتخب کر لو۔
یہ کام آپ کا ہے میرا نہیں۔

تو تھوڑے دن انتظار کرو — میں اُردو کی لغت لانا ہوں۔

اس کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک غور سے دیکھوں گا — یقیناً کوئی اچھا نام مل جائے گا میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔ نہیں میری جان نکالتے ہیں — میرا ایک دوست ہے اس کے جب بچی پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اُردو کی لغت نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا۔
کیا نام تھا۔

نکبت۔

اس کے معنی کیا ہیں۔

خوشبو۔

بڑا اچھا نام ہے — نکبت — یعنی خوشبو۔

تو یہی نام رکھ لو۔

زاہد کی بیوی نے اپنی بچی کو جو سو رہی تھی۔ ایک نظر دیکھا اور کہا نہیں

میں اپنی بیٹا کے لیے پرانا نام نہیں چاہتی ————— کوئی نیا نام تلاش کیجئے ————— جائیے ڈکشنری لے آئیے۔

زاہد مسکرایا۔ لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں۔

زاہد کی بیوی بھی مسکرائی میرا پرس الماری میں پڑا ہے اس میں جتنے روپے آپ

کو چاہئیں نکال لیجئے۔

زاہد نے بہت بہتر کہا اور الماری کھول کر اس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا۔

اور دس روپے کا نوٹ لے کر بازار روانہ ہو گیا کہ لغت خریدے۔

وہ کئی کتب فروش دکانوں میں گیا ————— کئی لغت دیکھے۔ بعض

تو بہت قیمتی تھے جن کی تین تین جلدیں تھیں۔ کچھ بڑے ناقص —————

آخر اس نے ایک لغت جس کی قیمت واہبی تھی خرید لیا اور راستے میں اس کی ورق

گردانی کرنا تاکہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔

اور گیسٹ ————— کیا اُسے لوگ گھسیٹنا شروع کر دیں —————
اور یہ رُلدو ————— شہزادی؟

اس کے جی میں آئی کہ لعنت کسی گندی موری میں پھینک دے اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے میری جان نام میں کچھ نہیں پڑا۔ بس یہ دعا کرو کہ بچی کی عمر دراز ہو۔ وہ مختلف خیالات میں غرق تھا۔ ————— لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پرانہ خیال کا باعث ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچے اور اپنی بچی کی پیشانی چومے۔ بغل میں لعنت تھی۔ ————— اس کو اس نے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کا دل دماغ متوازن نہیں تھا۔ اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ ————— مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے

بعد ہی بہت بُری طرح لپٹنے لگا اور ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا اتنے میں ایک خالی تانگہ آیا۔ اس نے اس کو ٹھہرایا اس میں بیٹھ کر تانگے والے سے کہا چلو مزنگ لے چلو۔ لیکن جلدی پہنچاؤ۔ مجھے وہاں ————— ایک بڑا ضروری کام ہے۔ مگر گھوڑا بہت ہی سست رفتار تھا یا شاید زائد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کو عجلت تھی وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ تانگے والے سے سخت سست الفاظ کہے جو وہ برداشت کرتا گیا۔ اس کی برداشت کا پیمانہ بے مزہ ہو گیا تو اس نے زائد کو تانگے سے اُتار دیا۔ ہائیکورٹ کے قریب اس نے زائد سے کرایہ بھی طلب نہ کیا۔ زائد اور زیادہ

پریشان ہوا وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک چوک میں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پشادری تانگہ آیا۔ اس میں بیٹھ کر وہ مزنگ پہنچا۔ کرایہ ادا کیا اور اپنے گھر میں داخل ہوا۔

کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں۔

وہ دروازے کے پاس رُک گیا ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی مشکل ہی سے بچے کی بیچاری — تشخ کے یہ دُورے بڑے خطرناک ہیں۔
 زائد ان عورتوں کی پروانہ کرتے ہوئے دیوانہ وار اندر بھاگا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ اور اس کی بیوی رہتے تھے اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کی فلک شکنگاہ چھیڑ سنی۔

اس کی بیوا دم توڑ مکی تھی — اور اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔
 زائد نے اپنا سر مینا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پر دے کو بھول کر بے اختیار اندر چلی آئیں اور زائد کو اس کمرے سے باہر نکال دیا ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس موٹر تھی وہ ڈاکٹر لے آیا۔ اس نے زائد کی بیوی کو ایک دوا بخشن لگائے جن سے وہ وہ ہوش میں آگئی۔

زائد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا بغل میں لغت دبائے خلا میں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنی بچی کے لیے کوئی نام تلاش کرنے میں محو ہے۔

بچی کو دفنانے کا وقت آیا تو زاہد بے ہوش ہو گیا۔ اس نے کوئی آنسو نہ بہایا۔ کفن میں بڑی بچی کو اٹھایا اور اپنے دوستوں اور جمالیوں کے ہمراہ قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پہلے ہی تیار کرالی گئی تھی۔ اس میں اس نے خود اُسے لٹایا اور اس کے ساتھ لغت رکھ دی۔ لوگوں نے سمجھا قرآن مجید ہے۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ مردوں کے ساتھ قرآن کون دفن کرتا ہے یہ تو سراسر کفر ہے۔ لیکن اُن میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا۔ بس آپس میں کُسر پھسرتے رہے۔

بچی کو دفن کر جب گھر آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت تیز بخار ہے سرسام کی کیفیت ہے۔

فوراُ ڈاکٹر بلا یا گیا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا اور زاہد سے کہا حالت بہت نازک ہے۔ میں علاج تجویز کئے دیتا ہوں لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق نہیں کہہ سکتا۔ زاہد کو الیا محسوس ہوا کہ اس پر بجلی آن گری ہے لیکن اس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا۔

تکلیف کیا ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ بہت سی تکلیفیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے۔ تیسری یہ کہ انہیں ایک سوپا پنچ ڈگری بخار ہے۔ ڈاکٹر نے چھڑیکے تجویز کئے دو نسخے پلانے والی دواؤں کے لکھے

جواب دیا۔

جی ہاں۔ کیوں؟ بس صدمے اٹھاتے اٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔
 زاہد نامیچ بن گیا بھائی میرے زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے۔ اس کو اچھی
 طرح استعمال کرو۔ خودکشی بہت بڑی بُزدلی ہے اپنی جان خود لینا کہاں کی عقلندی
 ہے اٹھو اپنے صدموں کو بھول جاؤ۔ انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں
 تو وہ خوشیوں سے کیا خط اٹھائے گا۔ چلو میرے ساتھ۔

پشاور سے لاہور تک

وہ انٹر کلاس کے زنانہ ڈبلے سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایچی کیس تھا جاوید پشاور سے اُسے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زنانہ ڈبلے کے پاس سے کئی مرتبہ گزرا۔

ٹرکی حسین تھی جاوید اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس کی ناک کی پھٹنگ پر چھوٹا سائل تھا۔ گالوں میں ننھے ننھے گڑھے تھے۔ جو اس کے چہرے پر بہت بھلے لگتے تھے۔ راولپنڈی اسٹیشن پر اس ٹرکی نے کھانا منگوایا۔ بڑے اطمینان سے ایک ایک ذوالہ اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی رہی۔ جاوید دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی ساتھ بیٹھ جائے اور دونوں مل کر کھانا کھائیں۔

وہ یقیناً اس کے پاس پہنچ جاتا مگر مصیبت یہ تھی کہ ڈبلہ زنانہ تھا عورتوں کا۔

پشاور سے لاہور تک

سے بھرا ہوا یہی وجہ ہے کہ جرأت نہ کر سکا۔ لڑکی نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے۔ جو بہت نازک تھے۔ لمبی لمبی مخروطی انگلیاں جن کو اس نے اچھی طرح صاف کیا اور انہی کیس سے تولیہ نکال کر اپنے ہاتھ پونچھے۔ پھر اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

جاوید گاڑی چلنے تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اپنے ڈبلے میں سوار ہو گیا اور اسی لڑکی کے خیالوں میں غرق ہو گیا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ بڑے اچھے گھرانے کی ہے۔ کانوں میں ٹاپس تھے دوائیکلوں میں اگر میرا اندازہ غلط نہیں میرے کی انگوٹیاں ہیں۔ لباس بہت عمدہ۔ ساٹن کی شلوار لفٹیا کی قمیض۔ شنون کا دوپٹہ۔ حیرت ہے کہ گھٹیا درجے میں کیوں سفر کر رہی ہے؟ پشاور سے آئی ہے وہاں کی عورتیں تو سخت پردہ کرتی ہیں۔ لیکن یہ برقعے کے بغیر وہاں سے گاڑی میں سوار ہوئی اور اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں۔ نہ کوئی عورت اکیلی سفر کر رہی ہے آخر یہ قصہ کیا ہے میرا خیال ہے کہ پشاور کی رہنے والی نہیں وہاں کسی عزیز سے ملنے گئی ہوگی۔ مگر اکیلی کیوں؟

کیا اسے ڈر نہیں لگا کہ اٹھا کر لے جائے گا کوئی۔ ایسے تنہا حسن پر تو ہر مرد جھپٹا مارنا چاہتا ہے۔ پھر جاوید کو ایک اندیشہ ہوا۔ کہ شادی شدہ تو نہیں۔ وہ دراصل دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس لڑکی کا پیچھا کرے گا۔ اور رومان لڑا کہ اس سے شادی کرے گا۔ وہ حرام کاری کا بالکل

قابل نہیں تھا۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ اسے صرف راول پنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اس کا گھر تھا۔ مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔ ایک اسٹیشن پر چیکنگ ہوئی جس کے باعث اُسے جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ مگر اس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ ٹکٹ چیک کرنے پوچھا۔

آپ کو کہاں تک جانا ہے۔

جاوید مسکرایا جی ابھی تک معلوم نہیں۔ آپ لاہور کا ٹکٹ بنا دیجئے کہ وہی آخری اسٹیشن ہے۔ ٹکٹ چیک کرنے اُسے لاہور کا ٹکٹ بنا دیا۔ روپے وصول کئے اور دوسرے اسٹیشن پر اُتر گیا۔ جاوید بھی اُترا کہ ٹرین کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرنا تھا۔

ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی دانتوں میں خال کر رہی تھی۔

جاوید کی طرف جب اس نے دیکھا تو اس کے دل و دماغ میں چیونٹیاں دوڑنے لگیں۔ اسی نے محسوس کیا کہ وہ اس کی موجودگی سے غافل نہیں ہے۔ سمجھ گئی ہے کہ وہ بار بار صرف اُسے ہی دیکھنے آتا ہے جاوید کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ مگر جاوید فرط جذبات کی وجہ سے فوراً وہاں سے ہٹ کر اپنے ڈبے میں چلا گیا اور رومانوں کی دنیا کی سیر کرنے لگا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے آس پاس کی تمام چیزیں مسکرا رہی

وہ پلٹ فارم پر اس ریڑھی کی طرف دوڑا جس میں پھل بیچے جاتے تھے اس نے جلدی جلدی چھ سیب خریدے کیونکہ وسل ہو چکی تھی۔
 دوڑا دوڑا وہ اس لڑکی کے پاس آیا۔ اس کو سیب دیئے اور کہا
 معاف کیجئے گا ————— وسل ہو رہی تھی اس لئے میں اچھے سیب
 چین نہ سکا۔

لڑکی مسکرائی ————— وہی دل فریب مسکراہٹ —————
 گاڑی حرکت میں آئی۔ جاوید اپنے کپاٹمنٹ میں داخل ہوتے گویا لانیپ رہا
 تھا۔ لیکن بہت خوش تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو دونوں جہاں
 مل گئے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن اب
 وہ اس کی لذت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی عمر پچیس برس کے قریب
 تھی۔ اس نے سوچا کہ اتنی دیر میں کتنا خشک رہا ہوں۔ آج معلوم ہوا ہے کہ محبت
 انسان کو کتنی تروتازہ بنا دیتی ہے ————— وہ سیب کھا رہی
 ہوگی۔

لیکن اس کے گال تو خود سیب ہیں۔ میں نے جو سیب اس کو دیئے
 کیا وہ ان کو دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوں گے۔ وہ میری محبت کے اشاروں
 کو سمجھ گئی۔ جب ہی تو وہ مسکرائی اور اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے
 بلایا اور کہا کہ میں اُسے سیب لا دوں۔ مجھ سے اگر وہ کہتی کہ گاڑی کا رخ
 پلٹ دوں تو میں خدا کی قسم اُس کی خاطر یہ بھی کر دیتا۔ گو مجھ میں یہ طاقت نہیں۔

دیکھئے۔

جاوید نے بڑی حیرت سے پوچھا آپ سگرٹ پیتی ہیں۔ وہ لڑکی پھر مسکرائی مگر اس نے کہا یہاں ایک عورت ہے پردہ دار اس کو سگرٹ پینے کی عادت ہے۔

اوہ ————— میں ابھی لایا ————— کس برانڈ کے سگرٹ ہوں؟

میرا خیال ہے وہ گولڈ فلیک پیتی ہے۔

میں ابھی حاضر کئے دیتا ہوں یہ کہہ کر جاوید اسٹال کی طرف دوڑا۔ وہاں سے اس نے دوپیکٹ لئے اور اس لڑکی کے حوالے کر دیئے۔ اُس نے شکریہ اُس عورت کی طرف سے ادا کیا جو سگرٹ پینے کی عادی تھی جاوید اب اور بھی خوش تھا کہ اس لڑکی سے ایک اور ملاقات ہو گئی۔ مگر اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا اس نے کئی مرتبہ خود کو کو سا کہ اس نے نام کیوں نہ پوچھا۔ اتنی باتیں ہوتی رہیں لیکن وہ اس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا آپ کا نام؟

اس نے ارادہ کر لیا کہ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اس سے نام ضرور پوچھے گا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ فوراً بتا دے گی کیونکہ اس میں قیامت ہی کیا تھی۔ اگلا اسٹیشن بہت دیر کے بعد آیا اس لئے کہ فاصلہ بہت لمبا تھا۔ جاوید کو بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ اس نے کئی

موتہ ٹائم ٹیل دیکھا۔ گھڑی بار بار دیکھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ انجن کے پر لگ جائیں تاکہ وہ اڑ کر جلدی اگلے اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ گاڑی ایک دم رُک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن کے ساتھ ایک بھینس ٹکرا گئی ہے وہ اپنے کپارٹمنٹ سے اتر کر ساتھ والے ڈبلے کے پاس پہنچا مگر لڑک اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔

مسافروں نے مری کٹی ہوئی بھینس کو پٹری سے ہٹانے میں کافی دیر لگا دی اتنے میں وہ جو غالباً دوسری طرف تماشا دیکھنے میں مشغول تھی آئی اور اپنی سیدٹ پر بیٹھ گئی۔ جاوید پر اس کی نظر پڑی تو مسکرائی۔ دہی دل فریب مسکراہٹ۔

جاوید کھڑکی کے پاس گیا۔ مگر اس کا نام نہ پوچھ سکا۔ لڑکی نے اس سے کہا یہ بھینسی کیوں گاڑی کے نیچے آجاتی ہیں؟ جاوید کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ گاڑی چلنے والی تھی اس لئے وہ اپنے کپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ کئی اسٹیشن آئے مگر وہ نہ اُترا۔ آخر لاہور آگیا۔ پلیٹ فارم پر جب گاڑی رُکی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا۔ لڑکی موجود تھی جاوید نے اپنا سامان نکلوایا اور اس سے جس نے ہاتھ میں اپنی کیس پکڑا ہوا تھا کہا لائے یہ ٹیلیفون کیس مجھے دے دیجئے۔

اس لڑکی نے اپنی کیس جاوید کے حوالے کر دیا۔ قلی نے جاوید کا سامان اٹھایا

اور دونوں باہر نکلے۔

جاوید نے اس سے پوچھا آپ کو کہاں جانا ہے۔
 لڑکی نے بڑے نرم و نازک ہلچے میں جواب دیا جی راوی روڈ۔
 چلیے میں آپ کو وہاں پھوڑا آتا ہوں۔
 بہت بہت شکریہ۔

تا نگہ راوی روڈ سے گذر رہا تھا ————— جاوید نے اس لڑکی
 سے پوچھا کہاں جائیے گا اب آپ؟

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ پنپا ہوئی جی ہیرا منڈی۔
 جاوید بوکھلا سا گیا۔ کیا آپ وہاں رہتی ہیں۔

لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا ————— جی ہاں —————
 میرا مکان دیکھ لیں۔ آج رات میرا مجرا سننے ضرور آئیے گا۔

جاوید پشاور سے لے کر لاہور تک اپنا مجرا سن چکا تھا۔ اس نے اس طوائف کو
 اس کے گھر پھوڑا اور اُسی تانگے میں سیدھا لاریوں کے اڈے پر پہنچا اور راولپنڈی روانہ
 ہو گیا۔

بجلی پہلوان

بجلی پہلوان کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں کہتے ہیں کہ وہ برق رفتار تھا۔ بجلی کے مانند دشمنوں پر گرتا تھا۔ اور انہیں بھسم کر دیتا تھا۔ — لیکن جب میں نے اُسے مغل بازار میں دیکھا تو وہ مجھے بے ضرر کرد کے مانند نظر آیا۔ بڑا پھسپھس سا۔ تو ندباہر نکلی ہوئی۔ بند بند ڈھیلے گال لٹکے ہوئے البتہ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ وہ مغل بازار میں ایک بزاز کی دکان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا تھا میں نے اس کو غور سے دیکھا مجھے اس میں کوئی غنڈہ پن نظر نہ آیا۔ حالانکہ اس کے متعلق مشہور یہی تھا کہ وہ ہندوؤں کا سب سے بڑا غنڈہ ہے وہ غنڈہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے غم و خال اس کی نفی کرتے تھے۔ میں تھوڑی دیر سامنے والی کتابوں کی دکان کے پاس کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک

مسلمان عورت جو بڑی مفلس دکھائی دیتی تھی بزاز کی دکان کے پاس پہنچی۔
بجلی پہلوان سے اس نے کہا۔

مجھے بجلی پہلوان سے ملنا ہے۔ بجلی پہلوان نے ہاتھ جوڑ کر پر نام
کیا ماماں ہی بجلی پہلوان ہوں۔ اس عورت نے اس کو سلام کیا۔ خدا
تمہیں سلامت رکھے۔ میں نے سنا ہے کہ تم بڑے دیالو ہو۔
بجلی نے بڑی انکاری سی سے کہا۔

ماما دیا لو پریشور ہے۔ میں کیا دیا کر سکتا ہوں۔ لیکن تم مجھے بتاؤ کہ میں کیا
سیوا کر سکتا ہوں۔ بیٹا مجھے اپنی جوان بیٹی کا بیاہ کرنا ہے تم اگر میری کچھ
مدد کر سکو تو میں ساری عمر تمہیں دعائیں دوں گی۔ بجلی نے اس عورت سے
پوچھا۔ کتنے روپوں میں کام چل جائے گا۔

عورت نے کہا۔

بیٹا تم خود ہی سمجھ لو۔ میں ایک بھکارن بن کر تمہارے

پاس آئی ہوں۔

بجلی نے کہا بھکارن منہ سے کہو۔ میرا فرض ہے کہ

تمہاری مدد کروں اس کے بعد اس نے بزاز سے جو تھان تہہ کر رہا تھا۔

کہا لالہ جی۔ دو ہزار روپے نکالئے۔

لالہ جی نے دو ہزار روپے فوراً صندوقچی سے نکالے اور گن کر بجلی پہلوان

کو دے دیئے یہ روپے اس نے اس عورت کو پیش کر دیئے ماما —
 جھگوان کرے تمہاری بیٹی کے بھاگ اچھے ہوں۔ وہ عورت چند لمحات
 کے لئے نوٹ ہاتھ میں لئے بت بنی کھڑی رہی۔ غالباً اس کو اتنے روپے
 ایک دم مل جانے کی توقع ہی نہیں تھی۔ جب وہ سنبھلی تو اس نے بجلی پہلوان
 پر دعاؤں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں نے دیکھا کہ پہلوان بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ آخر اس نے اس
 عورت سے کہا۔

ماما مجھے شرمندہ نہ کرو۔ جاؤ اپنی بیٹی کے دان و ہیز کا انتظام کرو۔
 اس کو میرا شیر یا دینا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا غنڈہ اور بد معاش
 ہے جو ایک ایسی عورت کو جو مسلمان ہے اور جسے وہ جانتا
 بھی نہیں دو ہزار روپے پکڑا دیتا ہے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ
 بڑا مخیر ہے ہر مہینے ہزاروں روپے دان کے طور پر دیتا ہے۔ مجھے چونکہ
 اس کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس لئے میں نے کافی چھان بین
 کے بعد بجلی پہلوان کے متعلق کئی معلومات حاصل کیں۔ محل بازار میں اکثر
 دکانیں اسی کی تھیں۔ حلوائی کی دکان بزاز کی دکان ہے شربت بیچنے والا ہے
 نیشے فروخت کرنے والا ہے پنہاری ہے غرضیکہ اس سرے سے اس
 سرے تک جہاں وہ بزاز کی دکان میں بیٹھتا تھا۔ اس نے ایک لائن

آف کیونیکش قائم کر رکھی تھی۔ تاکہ اگر پولیس چچا پہ مارنے کی غرض سے آئے تو اُسے فوراً اطلاع مل جائے دراصل اس کی دو بیٹھکوں میں جو ہزار کی دکان کے بالکل سامنے تھیں بہت بھاری جوا ہوتا تھا۔ ہر روز ہزاروں روپے فال کی صورت میں اُسے وصول ہو جاتے تھے۔ وہ خود جوا نہیں کھیلتا تھا نہ شراب پیتا تھا مگر اس کی بیٹھکوں میں شراب ہر وقت مل سکتی تھی اس سے بھی اس کی آمدن کافی تھی۔ شہر کے جتنے بڑے بڑے غنڈے تھے ان کا اس نے ہفتہ مقرر کر رکھا تھا۔ یعنی ہفتہ وارا نہیں ان کے مرتبے کے مطابق تنخواہ مل جاتی تھی میرا خیال ہے۔ اس نے یہ سلسلہ بطور حفظ مالِ مقدم شروع کیا تھا کہ وہ غنڈے بڑی خطرناک قسم کے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ غنڈے سب کے سب مسلمان تھے زیادہ تر لامتی دروازے کے۔ ہر ہفتے بجلی پہلوان کے پاس جاتے اور اپنی تنخواہ وصول کر لیتے۔ وہ ان کو کبھی ناامید نہ لٹاتا۔ اس لئے کہ اس کے پاس روپیہ عام تھا میں نے سنا کہ ایک دن وہ ہزار کی دکان پر حسب معمول بیٹھا تھا۔ کہ ایک ہندو بنیا جو کافی مالدار تھا اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی پہلوان جی میرا لڑکا خراب ہو گیا ہے۔ اس کو ٹھیک کر دیجئے۔ پہلوان نے مسکرا کر اس سے کہا میرے دولڑکے ہیں۔ بہت شریف۔ لوگ مجھے غنڈہ اور بد معاش کہتے ہیں لیکن میں نے انہیں

اس طرح پالا پوسا ہے کہ وہ بڑی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ مہاشہ جی یہ آپ کا قصہ رہے آپ کے لڑکے کا نہیں۔

بئیے نے ماتھ جوڑ کر کہا پہلوان جی ————— میں نے بھی اس کو اچھی طرح پالا پوسا ہے پر اس نے اب چوری چوری بہت بڑے کام شروع کر دیئے ہیں بجلی نے اپنا فیصلہ سنا دیا اس کی شادی کر دو۔

اس واقعے کو دس روز گزرے تھے کہ بجلی پہلوان ایک نوجوان لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ حالانکہ اس لڑکی اس قسم کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ ہو گئی اور بجلی پچاس سے اوپر ہو گا۔ آدمی بااثر اور مالدار تھا لڑکی کے والدین راضی ہو گئے چنانچہ شادی ہو گئی۔ اس نے شہر کے باہر ایک عالی شان کوٹھی بنائی تھی دوہن کو جب وہ اس میں لے کر گیا۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام جھاڑ اور فالووس ماند پڑ گئے ہیں۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ پہلی رات بجلی پہلوان نے کسرت کرنا چاہی مگر نہ کر سکا۔ اس لئے اس کے دماغ میں اپنی بیوی کا خیال کروٹیں لے رہا تھا اس کے دو جوان لڑکے تھے جو اُسی کوٹھی کے کسی کمرے میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے اس نے اپنی پہلی بیوی کو کہیں باہر بھیج دیا تھا۔ اُس کو اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کے بیتی نے دوسری شادی کر لی ہے ————— بجلی پہلوان سوچتا تھا کہ اسے اور کچھ نہیں تو اپنی پہلی استری کو مطلق ضرور کر دینا چاہیے تھا۔

ساری رات نئی نوپلی دُ اہن جس کی عمر سولہ سترہ برس کے قریب تھی
چوڑے چپکے پلنگ پر بیٹھی بجلی پہلوان کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتی رہی اُس
کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شادی کیا ہے کیا اُسے ہر روز اسی قسم کی باتیں سُننا
ہوں گی۔

کل میں تمہارے لئے دس ہزار کے زیور اور لاؤل گا۔

تم بڑی سُندر ہو۔

برنی کھاؤ گی یا پیڑے۔

یہ سارا شہر سمجھو کہ تمہارا ہے۔

یہ کوئی میں تمہارے نام لکھ دوں گا۔

کتنے نوکر چاہیں تمہیں ————— مجھے بتا دو۔ ایک منٹ میں انتظام
ہو جائے گا۔

میرے دو جوان لڑکے ہیں بہت شریف ————— تم اُن سے
جو کام لینا چاہو لے سکتی ہو وہ تمہارا حکم مانیں گے۔ دُ اہن ہر روز اسی قسم کی باتیں
سنتی رہی۔

حتیٰ کہ چھ مہینے گزر گئے۔ بجلی پہلوان دن بدن اس کی محبت میں غرق ہوتا گیا
وہ اس کے تیکھے نقش دیکھتا تو اپنی ساری پہلوانی بھول جاتا۔
اس کی پہلی بیوی بد شکل تھی۔ ان معنوں میں کہ اس میں کوئی کشش نہیں تھی وہ

ایک عام کھترانی تھی جو ایک بچہ جھنے کے بعد بوڑھی ہو جاتی ہے لیکن اس کی یہ دوسری بیوی بڑی ٹھوس تھی دس بچے پیدا کرنے کے بعد بھی وہ ثابت و مسلم رہ سکتی تھی بجلی پہلوان کا ایک وید دوست تھا اس کے پاس وہ کئی دنوں سے جا رہا تھا۔

اس نے بجلی پہلوان کو یقین دلایا کہ اب کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلوان خوش تھا۔ دید کے مال سے آتے ہوئے اس نے کئی اسیکمیں تیار کیں۔ راستے میں مٹھائی خریدی۔ سونے کے دو بڑے بڑے خوشنما کڑے لٹے۔

بارہ قیموں اور بارہ شلواروں کے نئے بہترین کپڑا قیمت ادا کئے بغیر حاصل کیا۔ اس لئے کہ وہ لوگ جو دکان کے مالک تھے اس سے مرعوب تھے اور قیمت لینے سے انکاری تھے۔ شام کو سات بجے وہ گھر پہنچا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں گیا۔ دیکھا تو وہاں اس کی دوسری بیوی نہیں تھی اس نے سوچا۔ شاید غسل خانے میں ہوگی۔ چنانچہ اس نے اپنا بوجھ میرا مطلب ہے وہ تھان وغیرہ پلنگ پر رکھ کر غسل خانے کا رخ کیا۔ مگر وہ خالی تھا۔

بجلی پہلوان بڑا متحیر ہوا کہ اس کی بیوی کہاں گئی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آئے مگر وہ کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ اس نے وید کی دی ہوئی گولیاں کھائیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا کہ اس کی بیوی آجائے

گی۔ آخر اُسے جانا کہاں ہے؟

وہ گولیاں کھا کر پٹنگ پر بیٹھا قیمفوں کے کپڑوں کو انگلیوں میں مسل مسل کر دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنی بیوی کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا اٹھ کر اُس کمرے میں گیا جو اس نے اپنے بڑے لڑکے کو دے رکھا تھا۔ اندر سے اس کی بیوی اور اس کے بیٹے کی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔

اس نے دستک دی۔ لیکن دروازہ نہ کھلا۔ پھر بڑے زور سے چلانا شروع کیا کہ دروازہ کھولو۔ اس وقت اس کا خون کھول رہا تھا۔ دروازہ مچھر بھی نہ کھلا۔

اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے کمرے کے اندر اس کی بیوی اور اُس کے بڑے لڑکے نے سانس لینا بھی بند کر دیا ہے۔
بجلی پہلوان نے بڑے کمرے میں جا کر گورکھی زبان میں ایک رُقعہ لکھا جس کی عبارت اُردو میں کچھ یوں ہو سکتی ہے۔

یہ کوٹھی اب تمہاری ہے۔ میری بیوی بھی اب تمہاری بیوی ہے۔
تمہارے لئے کچھ تحفے لایا تھا وہ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔

یہ رُقعہ لکھ کر اس نے ساٹن کے تھان کے ساتھ ٹانگ دیا۔

ایک زاہدہ ایک فاحشہ

جاوید مسعود سے میرا اتنا گہرا دوستانہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اس کی مرضی کے خلاف اٹھا نہیں سکتا تھا وہ مجھ پر نثار تھا میں اس پر ہم ہر روز قریب قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ رہتے وہ اپنے رشتہ داروں سے خوش نہیں تھا اس لئے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی بُرائی کرتا اور کہتا سگ باش برادر خورد مباش اور کبھی کبھی گھنٹوں خاموش رہتا جیسے غلامیں دیکھ رہا ہے میں اس کے ان لمحات سے تنگ آ کر جب زور سے پکارتا۔

جاوید یہ کیا بے ہودگی ہے۔ وہ ایک دم چونکتا اور معذرت طلب کرتا۔ سعادت بھائی معاف کرنا۔
اچھا تو پھر کیا ہوا وہ اس وقت بالکل خالی الذہن ہوتا۔ میں

کہتا بھی جاوید دیکھو ————— مجھے تمہارا یہ وقتاً فوقتاً معلوم نہیں
کن گہرائیوں میں کھوجانا بالکل پسند نہیں ————— مجھے تو ڈر لگتا
ہے ایک دن تم پاگل ہو جاؤ گے ————— یہ سن کر جاوید بہت ہنسا
پاگل ہونا بہت مشکل ہے سعادت ————— لیکن آہستہ آہستہ
اس کا خلا میں دیکھنا بڑھتا گیا ————— اور اس کی خاموشی طویل سکوت
میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ پیاری سی مسکراہٹ جو اس کے ہونٹوں پر ہر وقت
کھیلتی رہتی تھی بالکل پھینکی پڑ گئی۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا اسخربات کیا ہے تم تیسرے بن گئے ہو۔
ہوا کیا تمہیں ؟ ————— میں تمہارا دوست ہوں خدا کے لئے مجھ
سے تو اپنا راز نہ چھپاؤ۔ جاوید خاموش رہا جب میں نے اس کو بہت لعن طعن
کی تو اس نے اپنی زبان کھولی میں کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب
آؤں گا۔ اُس وقت تمہیں جو پوچھنا ہوگا۔ بتا دوں گا۔ وعدے کے مطابق
وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے یہاں آیا۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ بے حد
خوبصورت۔ اس میں سنو اینت کی جھلک تھی پڑھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں
تھی اس لئے میں آوارہ گرد تھا لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا
میں اس کو اپنے کمرے میں لے گیا جب میں نے اس کو سگریٹ پیش کیا تو اس
نے مجھ سے کہا کیا تم میرے روگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے ؟ میں نے کہا

مجھے معلوم نہیں ————— روگ ہے یا سوگ بہر حال تم تو اصل حالت میں نہیں ہو ————— تمہیں کوئی نہ کوئی ذہنی تکلیف ضرور ہے وہ مسکرایا ہے اس لئے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

محبت ————— میں بوکھلا گیا ————— جاوید کی عمر بمشکل اٹھارہ برس کی ہوگی۔ وہ خود ایک خوب رو لڑکی کی مانند اس کو کس لڑکی سے محبت ہو سکتی ہے یا ہو گئی ہے وہ تو کنواری لڑکیوں سے کہیں زیادہ شرمیلا اور چکیلا تھا وہ مجھ سے باتیں کرتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ دماغی دو شیرہ ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی عشقیہ فلم دیکھا ہے۔ آج مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے۔

مگر اس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا ایسا لگتا تھا کہ فکر کی انتہا گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے آخر میں نے اس سے پوچھا کس لڑکی سے محبت ہوئی ہے تمہیں؟

اس نے کوئی جھینپ محسوس نہ کی ایک لڑکی ہے زاہدہ ————— ہمارے پڑوس میں رہتی ہے بس اس سے محبت ہو گئی ہے عمر سولہ برس کے قریب ہے بہت خوبصورت ہے اور بھولی بھالی ————— پوری چُپچُپ سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں اُس نے میری محبت قبول کر لی ہے

میں نے اس سے پوچھا تو پھر اس اُداسی کا مطلب کیا ہے جو تم پر ہر وقت بھائی رستہ ہے اس نے مسکرا کر کہا۔

سعادۂ تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو ————— محبت اُداسی کا دوسرا نام ہے ہر وقت آدمی کھویا کھویا سا رہتا ہے اس لئے کہ اس کے دل و دماغ میں صرف خیالِ یاد ہوتا ہے ————— میں نے زاہدہ سے تمہارا ذکر کیا اور اس سے کہا کہ تمہارے بعد اگر کوئی مُستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوستِ سعادت ہے۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

بس میں نے کہہ دیا ————— اور زاہدہ نے بڑا اشتیاق
ظاہر کیا کہ میں تمہیں اس سے ملاؤں اُسے میری وہ چیز پسند ہے جسے میں
پسند کرتا ہوں ————— بولو چلو گے اپنی بجائی کو دیکھنے۔ میری
سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں اس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر لفظ
بجائی سجتا نہیں تھا۔

میری بات کا جواب دو۔

میں نے سرسری طور پر کہہ دیا چلیں گے ————— ضرور چلیں گے
 یہ کہاں؟

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل شام کو پانچ بجے کسی بہانے سے لارنس گارڈن آئے گی ————— آپ اپنے دوست کو ضرور ساتھ لائیے

لگا ————— اب تم کل ضرور تیار رہنا ————— بلکہ
خود ہی پانچ بجے سے پہلے پہلے واپس پہنچ جانا۔ ہم جم خانہ کلب کے اس طرف
لان میں تمہارا انتظار کرتے ہوں گے میں انکار کیسے کرتا اس لئے کہ مجھے جاوید
سے بے حد پیار تھا میں نے وعدہ کر لیا لیکن مجھے اس پر کچھ ترس آ رہا تھا۔
میں نے اس سے اچانک پوچھا۔

لڑکی شریف اور پاکباز ہے نا؟ جاوید کا چہرہ غصے سے تھماتے لگا۔
میں زاہدہ کے بارے میں ایسی باتیں نہ سوچ سکتا ہوں نہ سن سکتا ہوں
تمہیں اگر اس سے ملنا ہے تو ٹھیک پانچ بجے کل شام لارنس گارڈن پہنچ جانا۔
خدا حافظ۔

جب وہ ایک دم اٹھ کر چلا گیا تو میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے بڑی
بدامت محسوس ہوئی کہ میں نے اس سے ایسا سوال کیوں کیا۔ جس سے اُس
کے جذبات مجروح ہوئے۔

آخر وہ اس سے محبت کرتا تھا اگر کوئی لڑکی کسی سے محبت کرے تو
ضروری نہیں کہ وہ بدکردار ہو۔ جاوید مجھے اپنا مخلص ترین دوست تسلیم کرتا
تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناراضی کے باوجود مجھ سے برہم نہ ہوا اور مجھ کو جاتے
ہوئے کہہ گیا کہ وہ شام کو لارنس گارڈن آئے میں سوچتا تھا کہ زاہدہ سے
مل کر میں اُس سے کس قسم کی باتیں کروں گا۔

بے شمار باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ لیکن وہ اس قابل نہیں تھیں کہ کسی دوست کی محبوبہ سے کی جائیں۔ میرے متعلق خدا معلوم وہ اس سے کیا کچھ کہہ چکا تھا۔ یقیناً اس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار بڑے والہانہ طور پر کیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زاہدہ کے دل میں میری طرف سے حسد پیدا ہو گیا ہو۔ کیونکہ عورتیں اپنے عاشقوں کی محبت بٹتے نہیں دیکھ سکتیں شاید میرا مذاق اڑانے کے لیے اس نے جاوید سے کہا ہو کہ تم مجھے اپنے پیارے دوستوں سے ضرور ملاؤ بہر حال مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے ملنا تھا۔

اس تقریب پر میں نے سوچا کوئی تحفہ تولے جانا چاہیے۔ رات بھر غور کرتا رہا آخر ایک تحفہ سمجھ میں آیا کہ سونے کے ٹاپس ٹھیک رہیں گے۔ انارکلی میں گیا تو سب دکانیں بند۔ معلوم ہوا کہ اتوار کی تعطیل ہے۔ لیکن ایک جوہری کی دکان کھلی تھی۔ اس سے ٹاپس خریدے اور واپس گھر آیا۔ چار بجے مک شش و پنج میں مبتلا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہوتا ہے۔ لڑکیوں سے بے تکلف باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا اس لئے مجھ پر گھبراہٹ کا عالم طاری تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر سونا چاہا۔ مگر کروٹیں بدلتا رہا۔ ٹاپس میرے تیکے کے نیچے پڑے تھے ایسا لگتا تھا کہ وہ دیکھتے ہوئے انکارے ہیں۔ اٹھا۔۔۔۔۔ غسل کیا اس کے بعد شیو۔۔۔۔۔

پھر نہایا اور کپڑے بدل کر بڑے کمرے میں کلاک کی ٹمک ٹمک سننے لگا۔
 تین بج چکے تھے۔ اخبار اٹھایا۔ مگر اس کی ایک خبر نہ
 پڑھ سکا۔ عجب مہیبت تھی۔ عشق میرا دست
 کر رہا تھا اور میں ایک قسم کا مجنون بن گیا تھا میرا بہترین سوٹ رنگین کا سلا
 ہوا میرے بدن پر تھا روال نیا شو بھی نئے۔ میں نے یہ سنگھار
 اس لئے کیا تھا کہ جاوید نے جو تعریف کے پل زاہدہ کے سامنے باندھے ہیں کہیں
 ٹوٹ نہ جائیں۔ ساڑھے چار بجے میں اٹھا۔ اپنی ریلے کی بہترین سائیکل لی اور
 آہستہ آہستہ لارنس گارڈن روانہ ہو گیا۔

جم خانہ کلب کے اس طرف لان میں مجھے جاوید دکھائی دیا۔ وہ اکیلا
 تھا اس نے زور کا غرہ بلند کیا۔ میں جب سائیکل پر سے اترتا تو وہ میرے
 ساتھ چھٹ گیا کہنے لگا۔

تم پہلے ہی پہنچ گئے۔ بہت اچھا کیا۔ زاہدہ اب آتی ہی ہوگی
 میں نے تو اس سے کہا تھا کہ میں اپنی کار بھیج دوں گا۔ مگر وہ رضامند نہ
 ہوئی۔ مانگے میں آئے گی۔

جاوید کے باپ کی ایک کار تھی۔ بے بی اسٹن۔ خدا معلوم کس صدی
 کا ماڈل تھا۔ زیادہ تر یہ جاوید ہی کے استعمال میں آتی تھی۔ لارنس گارڈن
 میں داخل ہوتے وقت یہ عجوبہ روزگار موٹر دیکھ لی تھی میں نے اس سے کہا آؤ

بیٹھ جائیں لیکن وہ رنما نہ ہوا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ تم ایسا کرو —
 باہر گیٹ پر جاؤ — ایک تانگہ آئے گا جس میں ایک ڈبلی تیلی
 لڑکی سیاہ بُرقع پہنے ہوگی۔ تم تانگے والے کو ٹھہرا لینا اور اس سے کہنا۔ میں
 جاوید کا دوست سعادۂ ہوں — اس نے مجھے تمہارے
 استقبال کے لیے بھیجا ہے۔

نہیں جاوید — مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔
 لا حول ولا — جب تم نام بتا دو گے تو اُسے چوں کرنے
 کی بھی جرأت نہیں ہوگی۔ تمہاری جرأت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے یا زندگی
 میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہیئے۔ جسے بعد میں یاد کر کے آدمی محفوظ ہو
 سکے۔

جب زاہدہ سے میری شناسائی ہو جائے گی تو ہم آج کے اس واقعے کو
 یاد کر کے خوب ہنسا کریں گے۔ جاؤ میرے بھائی —
 وہ بس اب آتی ہی ہوگی۔

میں جاوید کا کہنا کیسے موڑ سکتا تھا۔ بادل ناخواستہ چلا گیا اور گیٹ
 سے کچھ دور کھڑا رہ کر اس تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ جس میں زاہدہ اکیلی
 کالے بُرقع میں ہو۔

آدھے گھنٹے کے بعد ایک تانگہ اندر داخل ہوا۔ جس میں ایک لڑکی

کالے ریشمی برقعے میں بلکوس پچھلی نشست پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔

میں جھپٹتا سمٹتا ڈرتا آگے بڑھا اور تانگے والے کو روکا۔ اُس نے فوراً اپنا تانگہ روک لیا۔

میں نے اس سے کہا یہ سواری کہاں سے آئی ہے؟ تانگے والے نے ذرا سختی سے جواب دیا۔

تمہیں اس سے کیا مطلب ——— جاؤ اپنا کام کرو۔

برقع پوش لڑکی نے مہین سی آواز میں تانگے والے کو ڈانٹا تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے ——— پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی آپ نے تانگہ کیوں روکا تھا جناب ——— میں نے ہسکلا کے جواب دیا۔ جاوید ——— جاوید ——— میں جاوید کا دوست سادات ہوں۔

آپ کا نام زاہدہ ہے نا اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

جی ہاں ——— میں آپ کے متعلق اُن سے بہت سی باتیں سن چکی ہوں۔

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہیں ——— وہ ادھر جم خانہ کلب کے پاس گھاس کے تختے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔

اُس نے اپنی نقاب اٹھائی ابھی خاصی شکل صورت تھی مسکرا کر مجھ سے کہا
 آپ اگلی نشست پر بیٹھ جائیے ————— مجھے ایک ضروری کام ہے —————
 ابھی چند منٹوں میں نوٹ آئیں گے آپ کے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس
 پر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوچوان
 کے ساتھ بیٹھ گیا تاکہ اسمبلی ہال کے پاس سے گذرنا تو میں نے تانگے والے سے
 کہا بھائی صاحب یہاں کوئی سگرٹ والے کی دکان ہو تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر جانا
 میرے سگرٹ ختم ہو گئے ہیں۔ ذرا آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سگرٹ پان والا
 بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے اپنا تانگہ روکا۔ میں اُترا تو زاہدہ نے کہا۔
 آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں یہ تانگے والا لے آئے گا۔
 میں نے کہا۔

اُس میں تکلیف کی کیا بات ہے اور اس پان والا لے کے پاس پہنچ گیا ایک
 ڈیمہ گولڈ فلیک کی لی۔
 ایک باجس اور دو پان حب پانچ کے نوٹ سے باقی پیسے لے کر مڑا تو
 کوچوان میرے پیچھے کھڑا تھا۔
 اس نے دبی آواز میں مجھ سے کہا۔
 حضور! اس عورت سے بچ کر رہیے گا۔
 میں بڑا حیران ہوا کیوں۔

کو چوان نے بڑے وثوق سے کہا۔

فاحشہ ہے ————— اس کا کام یہی ہے کہ شریف اور نوجوان لڑکوں کو بچانستی ہے۔ میرے تانگے میں اکثر بیٹھتی ہے یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

میں نے تانگے والے سے کہا۔

خدا کے لیے تم اُسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائے ہو ————— کہہ دینا کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ میرا دوست دہلی لارنس گارڈنز میں انتظار کر رہا ہے۔

تانگے والا چلا گیا ————— معلوم نہیں اس نے زاہدہ سے کیا کہا۔

میں نے ایک دوسرا تانگہ لیا اور سیدھا لارنس گارڈنز پہنچا۔ دیکھا کہ جاوید ایک خوبصورت لڑکی سے محو گفتگو ہے بڑی شرمیلی اور مجبلی تھی۔ میں جب پاس آیا تو اس نے فوراً اپنے دوپٹے سے منہ چھپا لیا۔ جاوید نے بڑی غفلی آمیز ہلچے میں مجھ سے کہا۔

تم کہاں غارت ہو گئے تھے ————— تمہاری بھابی کب کی آئی بیٹھی ہیں۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں سخت بوکھلا گیا ————— اس بوکھلاہٹ میں یہ کہہ گیا تو وہ کون تھیں جو مجھے تانگے میں ملیں؟

جاوید نہ ساق نہ کرد مجھ سے ————— بیٹھ جاؤ اور اپنی
 بھابی سے باتیں کرو۔ یہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں ہیں بیٹھ گیا اور کوئی
 سلیقے کی بات نہ کر سکا اس لئے کہ میرے دل و دماغ پر وہ لڑکی یا عورت
 مسلط ہو گئی تھی جس کے متعلق مانگے والے نے مجھ بڑے خلوص سے بتا دیا تھا
 کہ فاحشہ ہے۔

شیدا

شیدے کے متعلق امرتسر میں یہ مشہور تھا کہ وہ چٹان سے بھی ٹکڑے کر لے سکتا ہے۔ اُس میں بلا کی پھرتی اور طاقت تھی گو تن و توش کے لحاظ سے وہ ایک کمزور انسان دکھائی دیتا تھا۔ لیکن امرتسر کے سارے غنڈے اس سے خوف کھاتے اور اس کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ فرید کا چوک معلوم نہیں فسادات کے بعد اس کی کیا حالت ہے عجیب و غریب جگہ تھی۔ یہاں شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر اور حکیم بھی موچی اور جلاہے جواری اور بد معاش نیک اور پرہیزگار سبھی یہاں بستے تھے۔ ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔

شیدے کی سرگرمیاں چوک سے باہر ہوتی تھیں یعنی وہ اپنے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا۔ جس پر اس کے محلے والوں کو اعتراض ہو اس نے جتنی لڑائیاں لڑیں دوسرے غنڈوں کے محلے میں۔

وہ کہا کرتا تھا۔ اپنے محلے میں کسی دوسرے محلے کے غنڈے سے لڑنا نامردی کی نشانی ہے۔ مزا تو یہ ہے کہ دشمن کو اس کی اپنی جگہ پر مارا جائے اور یہ سچ تھا۔ ایک بار پٹرنگوں سے اس کی ٹھن گئی۔ وہ کئی مرتبہ چوک فرید سے گذرے۔ بڑکیں مارتے نعرے لگاتے شیدے کو گایاں دیتے۔ وہ سب کس رہا تھا یہ پتہ اس نے اُن سے بھڑانا مناسب نہ سمجھا اور خاموش رحمان تاندر دکی دکان میں بیٹھا رہا۔

لیکن دو گھنٹوں کے بعد وہ پٹرنگوں کے محلے کی طرف روانہ ہوا۔ اکیلا بالکل اکیلا اور پھر غیر مسلح۔ وہاں جا کر اُس نے ایک فلک شکاف نعرہ بلند کیا اور پٹرنگوں کو جو اپنے کام میں مصروف تھے لکارا نکلو باہر۔ تمہاری دس پندرہ پٹرننگ لائٹیاں لے کر باہر نکل آئے اور جنگ شروع ہو گئی میرا خیال ہے شیدا گنگے اور بنوٹ کا ماہر تھا۔ اُس پر لائٹیاں برسائی گئیں۔

لیکن اس نے ایک بھی ضرب اپنے پر نہ لگنے دی۔ ایسے پینترے بدلتا رہا کہ پٹرنگوں کی سٹی گم ہو گئی۔ آخر اس نے ایک پٹرننگ سے بڑی چابکدستی سے لائٹھی چھینی اور حملہ آوروں کو مار مار کے ادھ موا کر دیا۔ دوسرے روز اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ دو برس قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ وہ جیل چلا گیا جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہے اس دوران میں اس کی بوڑھی ماں دقتا فوقتا

ملاقات کے لیے آتی رہی۔ وہ مشقت کرتا تھا لیکن اُسے کوئی کوفت نہیں
 ہوتی تھی وہ سوچتا تھا کہ چلو ورزش ہو رہی ہے صحت ٹھیک رہے گی۔ اس
 کی صحت باوجود اس کے کہ کھانا بڑا دامیات ہوتا تھا۔ پہلے سے بہتر تھی
 اُس کا وزن بڑھ گیا تھا لیکن وہ بعض اوقات منہم ہو جاتا اور اپنی کوٹھڑی میں ساری
 رات جاگتا رہتا اُس کے ہونٹوں پر پنچابی کی یہ بولی ہوتی رہ

کی کیجئے تیسری یاری

مہتاں مہتاں ہو کے ٹٹ گئی

ایک برس گزر گیا۔ مشقت کرتے کرتے — اب اُس کی
 افسردگی کا دور شروع ہوا۔ اس نے مختلف بولیاں گانا شروع کر دیں۔
 مجھے ایک قیدی نے بتایا جو اس کے ساتھ والی کوٹھڑی میں تھا کہ وہ
 بولیاں یہ گایا کرتا تھا

بے جان گئے یار گواپے

ٹھیکے لے لے پتیاں دے

اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنا گم شد محبوب مل جائے گا اگر تو
 دریا کے ساحل پر کشتیاں چلانے کا ٹھیکہ لے لے

گڈی کٹ جاندی جھنڈا دی پریم والی

منڈے لے جاندے اونہاں وی ڈور لڑکے

یعنی جن کی محبت کا پتنگ کٹ جاتا ہے تو لڑکے بالے بڑا شور مچاتے ہیں اور ان کی ڈور لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ میں اب اور بولیوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان سب کا جو شیدے کے ہونٹوں پر ہوتی تھیں ایک ہی قسم کا مفہوم ہے۔

اس قیدی نے مجھ سے کہا۔

ہم سمجھ گئے تھے کہ شیدا کس کے عشق میں گرفتار ہے۔
کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ اُسے آہیں بھرتے بھی دیکھا۔ مشقت کے دوران وہ بالکل خاموش رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی اور دنیا کی سیر کر رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک لمبی آہ بھرتا اور پھر اپنے خیالات میں گھو جاتا۔

ڈیڑھ برس کے بعد جب شیدا خود کشی کا ارادہ کر چکا تھا اور کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی ختم کر دے کہ اُسے اطلاع ملی کہ ایک جوان لڑکی تم سے ملنے آئی ہے۔

اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جوان لڑکی کون ہو سکتی ہے اس کی تو صرف ماں ہی ماں تھی جو اس سے اپنی ممتا کے باعث ملنے آجایا کرتی تھی۔

ملاقات کا انتظام ہوا۔ شیدا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ مسلح سپاہی۔

لڑکی کو بلایا گیا۔ شیدے نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ بزرگ پوش عورت

آہنی پنجرے کی طرف بڑھ رہی ہے اس کو ابھی تک یہ ہیرت تھی
کہ یہ عورت یا لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ سفید برقع تھا۔ جب وہ پاس
آئی تو اس نے نقاب اٹھائی۔

شیدا چیخا تم — تم کیسے۔ زلیخا جو کہ ٹیڑگوں کی لڑکی تھی زارہ و قطار
رونے لگی۔ اس کے سلق میں لفظ اُنک اُنک گئے میں تم سے ملنے آئی ہوں۔
لیکن — لیکن مجھے — مجھے معاف کر دینا اتنی
دیر کے بعد آئی ہوں — تم — خدا معلوم —
اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچتے ہو گے۔

شیدہ نے سلاخوں کے ساتھ مر لگا کر کہا۔
نہیں میری جان — میں تمہارے متعلق سوچتا ضرور رہا۔
لیکن جانتا تھا کہ تم مجبور ہو۔
زلیخا نے روتے ہوئے کہا۔

میں واقعی مجبور تھی — لیکن آج مجھے موقع ملا تو میں آ
گئی۔ سچ کہتی ہوں میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا تھا — یہ موقع نہیں
کیسے مل گیا؟

زلیخا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے آبا کا انتقال ہو گیا ہے کل
ان کا چاہیو ال تھا۔

شیدا مرحوم سے اپنی مخلصیت بھول گیا۔ خدا انہیں جنت بخشے۔
 مجھے یہ خبر سن کر بڑا افسوس ہوا یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
 صبر کر وزلیخا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ زلیخا نے
 اپنے سفید برفے سے آنسو پونچھے میں نے بہت صبر کیا ہے۔ شیدا اب اور
 کتنی دیر کرنا پڑے گا۔

تم یہاں سے کب نکلو گے؟ بس چھ مہینے رہ گئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ
 مجھے بہت پہلے ہی چھوڑ دیں گے۔ یہاں کے سب افسر مجھ پر مہربان ہیں۔
 زلیخا کی آواز میں محبت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا جلدی آؤ پیارے۔
 مجھے اب تمہاری ہونے سے روکنے والا کوئی نہیں۔ خدا کی قسم اگر کسی نے
 تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں خود اس سے نہٹ لوں گی۔
 میں نہیں چاہتی کہ تم پھر اسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔
 سنتری نے کہا۔

وقت ختم ہو گیا۔ چنانچہ ان کی ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ زلیخا روتی روتی چلی گئی۔
 اور شیدا دل میں مسرت اور آنکھ میں آنسو لیے جیل کے اندر چلا گیا۔ جہاں اس کو شفقت
 کرناستی اُس دن اس نے اتنا کام کیا کہ جیلر دنگ رہ گیا۔ دہائیوں کے بعد اُسے
 رہا کر دیا گیا۔ اس دوران میں زلیخا دو مرتبہ اس سے ملاقات کرنے
 آئی تھی۔ اُس نے آخری ملاقات میں

اس کو بتا دیا تھا کہ وہ کس تاریخ کو جیل سے باہر نکلے گا۔

چنانچہ وہ گیٹ کے پاس برقع پہنے کھڑی تھی۔ دونوں فرط مسرت میں آنسو بہانے لگے۔ شیدے نے تانگہ لیا۔ دونوں اس میں سوار ہوئے اور شہر کی جانب چلے۔ لیکن شیدے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زلیخا کو کہاں لے جائے گا۔ زلیخا تمہیں کہاں جانا ہے۔

زلیخا نے جواب دیا۔

مجھے معلوم نہیں — تم جہاں لے جاؤ گے۔ وہیں چلی جاؤں گی۔

شیدے نے کچھ دیر سوچا اور زلیخا سے کہا۔

نہیں — یہ ٹھیک نہیں تم اپنے گھر جاؤ۔

دنیا مجھے غنڈہ کہتی ہے لیکن میں تمہیں جائز طریقے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے باقاعدہ شادی کروں گا۔

زلیخا نے پوچھا کب؟

بس ایک دو مہینے لگ جائیں گے — میں اپنی جوئے کی

بیٹھک پھر سے قائم کر لوں۔ اس عرصے میں اتنا رد پیہ اکٹھا ہو جائے گا میں

تمہارے لئے زیور کپڑے خرید سکوں —

زلیخا بہت متاثر ہوئی۔

تم کتنے اچھے ہو شیدے جتنی دیر تم کہو گے میں اس گھڑی کے لیے انتظار کروں گی جب میں تمہاری ہو جاؤں گی۔

شیدا ذرا جذباتی ہو گیا جانی تم اب بھی میری ہو ————— میں بھی تمہارا ہوں ————— لیکن میں چاہتا ہوں جو کام ہو طور طریقے سے ہو میں اُن لوگوں میں سے نہیں جو دوسروں کی جوان کنواری لڑکیوں کو درغلا کر خراب کرتے ہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمہاری خاطر میں نے مار کھائی اور قریب قریب دو برس جیل کاٹے۔

خداوند پاک کی قسم کھا کے کہتا ہوں ہر وقت ہونٹوں پر تمہارا نام رہتا تھا۔
زلیخا نے کہا۔

میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی لیکن تمہارے لئے میں نے ایک ہمسائی سے سیکھی اور بلا ناغہ پانچوں وقت پڑھتی رہی ————— ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ خدا تمہیں ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ شیدے نے شہر پہنچے ہی دوسرا تانگہ لے لیا اور زلیخا سے جدا ہو گیا تاکہ وہ اپنے گھر جائے اور وہ اپنے شیدے نے ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر ایک ہزار روپے پیدا کر لئے۔ ان سے اس نے زلیخا کے لیے سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں بنوائیں۔ گلے کے لیے ایک نکلس بھی لیا۔ اب وہ پوری طرح لیس تھا۔

ایک دن وہ اپنے گھر میں اُدھر پیڑھی پر بیٹھا کھانا کھانے لگا تھا کہ نیچے سے

کسی عورت کے بہن کرنے جیسی آواز آئی وہ اُسے پکار رہی تھی اور ساتھ ساتھ
کو سننے بھی دے رہی تھی۔

شیدے نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا تو ایک بڑھیا تھی جو اس کے
محلے کی نہیں تھی اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا اور پوچھا کیا تم ہی شیدے ہو۔
ہاں ماں۔

خدا کرے نہ رہو اس دنیا کے تنگے پر ————— تمہاری جوانی ٹوٹے۔
تم پر بھلی گرے۔

شیدے نے کسی قدر غصہ میں اُس بڑھیا سے پوچھا۔
بات کیا ہے۔

بڑھیا کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہو گیا میری بچی تم پر جان چھڑکے اور تمہیں کچھ بتہی
نہیں۔

شیدے نے حیرت سے اُس بڑھیا سے سوال کیا کون ہے تمہاری بچی؟
زلیخا اور کون۔

کیوں کیا ہوا اُس کو۔

بڑھیا رونے لگی وہ تم سے ملتی تھی تم غنڈے ہو اس لئے ایک تھانیدار نے
ذہرستی اس کے ساتھ اپنا منہ کالا کیا۔ شیدے کے ہوش و حواس ایک لمحے کے لیے
غائب ہو گئے مگر سنبھل کر اس نے بڑھیا سے پوچھا کیا نام ہے اس تھانیدار کا؟

بڑھیا کانپ رہی تھی کرم داد ————— تم یہاں اُد پر مزے میں بیٹھے ہو
 بہت بڑے غنڈے بنے پھرتے ہو ————— اگر تم میں تھوڑی سی بھی عزت
 ہے تو جاؤ اور اس تھانیدار کا سر گنڈا سے کاٹ کر رکھ دو۔

شیدے نے کچھ نہ کہا۔ کھڑکی سے ہٹ کر اس نے بڑے اطمینان سے کھانا کھایا
 پیٹ بھر کے دو گلاس پانی کے لیے اور ایک کونے میں رکھی ہوئی کلباڑی لے کر باہر
 چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد اس نے زلیخا کے گھر دروازے پر دستک دی۔ وہی بڑھیا
 باہر نکلی ————— شیدے کے ہاتھ میں خون آلود کلباڑی تھی۔ اُس نے بڑے
 پرسکون لہجے میں اُس سے کہا ماں ————— جو کام تم نے مجھ سے کہا تھا کر آیا
 ہوں ————— زلیخا سے میرا سلام کہنا ————— میں اب چلتا ہوں یہ کہہ کر دیکھا
 کہ تو الگ گیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

بڈھا کھوسٹ

یہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد کی بات ہے۔ جب میرا عزیز ترین دوست یونیٹنٹ کرنل محمد سلیم شیخ (اب) ایران، عراق اور دوسرے محاذوں سے ہوتا ہوا بجے پہنچا۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا۔ میرا فلیٹ کہاں ہے ہم میں گلہ ہے گا ہے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ مزا نہیں آتا تھا۔ اس لئے کہ ہر خط سنسر ہوتا ہے۔ ادھر سے جلتے یا ادھر سے آئے عجیب مصیبت تھی۔ مگر اب ان مصیبتوں کا ذکر کیا کرنا ہے بمبئی کے بی بی اینڈ سی آئی اے کے ٹرمینس پر اُس کی پوسٹنگ ہوئی۔ اُس وقت وہ صرف یونیٹنٹ تھا ہم دونوں وسیع وریض ریلوے اسٹیشن کے برفے میں بیٹھ گئے اور دوپہر کے بارہ ایک بجے تک ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر پیتے رہے۔ اُس نے اُس دوران میں مجھے کئی کہانیاں سنائیں۔ جن میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اس نے ایران عراق اور خدا معلوم کن کن ملکوں کے اپنے معاشقے سنائے
میں سنتا رہا۔ پیشہ ور عاشق تو کالج کے زمانے سے تھا۔ اُس کی داستانیں اگر
میں سناؤں۔ تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ بہر حال آپ کو اتنا بتانا ضروری ہے
کہ اُسے لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا کمر معلوم تھا۔ گورڈن کالج راولپنڈی
میں وہ راہ اندر تھا۔ اُس کے دربار میں وہاں کی تمام پریاں مجرا عرض کرتی تھیں۔
غور بصورت تھا۔ کافی خوبصورت مگر اُس کا مشن مردانہ حسن تھا۔ پتلی نوکیلی ناک
جو یقیناً اپنا کام کر جاتی ہوگی۔ چھٹی چھوٹی گہرے بھروسے رنگ کی آنکھیں جو اُس
کے چہرے پر سج گئی تھیں۔ بڑی ہوتیں تو شاید اُس کے چہرے کی ساری
کشش ماری جاتی۔

وہ کھلنڈرا تھا۔ جس طرح لارڈ بانٹن مرت کچھ عرصے کے لئے کسی سے دلچسپی
لیتا تھا۔ اور پھر اُسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ جیسے وہ اُس کی زندگی میں کبھی آئی
ہی نہیں۔ اسی طرح کا سلوک وہ اپنے جال میں پھنسی ہوئی لڑکیوں سے کرتا۔ مجھے
اُس کا یہ رویہ پسند نہیں تھا۔ کہ یہ میری نظر میں بہت ظالمانہ ہے مگر وہ بے پرواہ
تھا کہا کرتا، اُو کے پٹھے ————— غالب پڑھو وہ کیا کہتا ہے —————
اُسے متن یاد کبھی نہیں رہتا تھا مگر اُس کا مفہوم اپنے الفاظ میں ادا کر دیا کرتا
وہ کہتا ہے وہی شارح طوبے اور جنت میں وہی ایک حور
واللہ زندگی اجیرن ہو جائے گی ————— شہد کی مکھی بنو کلی

تو ڈوب مرو۔۔۔ لیکن تم تیرنا جانتے ہو۔ ڈوبنے کا کام ہم اپنے ذمہ لیتے ہیں۔
 شیخ سلیم کو اس قسم کی باتیں عموماً کھا جاتی تھیں۔۔۔۔۔ اُس
 نے اپنی مہین مہین مونچھوں کو تاؤ دینے کی کوشش کی اور کہا اچھا تم دیکھ لینا۔
 کیا ہوگا اس کی پارٹی کے ایک قوی ہیکل لڑکے نے پوچھا کیا ہوگا۔
 شیخ سلیم نے اس کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا۔۔۔۔۔ ہوگا تمہاری ماں کا سر۔
 جب شادی کا دن آئے گا دیکھ لینا۔۔۔۔۔ چلو آؤ میرے ساتھ
 مجھے تم سے چند باتیں کرنی ہیں۔

شادی کا دن آگیا۔ بارات جب دو لہا والوں کے گھر کے پاس پہنچی تو کوئی
 شخص سر پر سہرے باندھے بڑے اچھے گھوڑے پر سوار اندر داخل ہو گیا۔ دو لہا موٹر
 میں تھا جس پر چھوٹوں کا جال بنا ہوا تھا۔

گھوڑا سوار سہرے سے لدا پھندا شامیانے کے پاس تھا۔ گھوڑا خود دو لہا
 بنا ہوا تھا۔ دو لہن کا باپ اور اس کے رشتہ دار آگے بڑھے۔ گھوڑے کا
 مالک بھاگا بھاگا آگیا تھا۔

اس سرے سے لدرے ہوئے آدمی کو اس جگہ بٹھا دیا گیا۔ جہاں دو لہن کو
 بھی ساتھ بیٹھنا تھا۔ بیچ میں ہوں کُند تھا۔ جس میں چھوٹی چھوٹی لکڑیوں
 کے ٹکڑے جل رہے تھے۔ انہوں نے ننگے بدن اٹھ کر دو لہا کو اشیر داد
 دیا اور کہا۔

کلی کارس چوسو — بکھی کسی مصری کی نہ بنو جو وہیں چپک کر رہ جائے پھر اُس نے اقبال کے ایک شعر کا اپنا بلیر کا گلاں خاڑ کرتے ہوئے دیا، کیا کہا ہے قبا نے سہ

تو یہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

در نہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی کھتا

ثابت ہوا کہ تم نہ عرف نادان ہو بلکہ درجہ اول بنا سکتی گھی کی طرح درجہ اول چغہ بھی ہو — اب ہٹاؤ اس بکواس کو۔

میں نے یہ بکواس اس طرح ہٹائی جس طرح بیرے نے میری ریکی خالی بوتل پر بیشتر اس کے کہ میں اصل کہانی کی طرف آؤں میں آپ کو شیخ سلیم سے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ہم گورڈن کانج میں بی اے فائنل میں پڑھتے تھے کہ کرسس کی پھٹیوں میں ایک رکنی کی شادی کی اڑتی اڑتی افواہ ہمیں ملی۔ یہ رکنی ہماری ہی کسی کلاس میں پڑھتی تھی اور کچھ عرصہ پہلے بری طرح شیخ سلیم پر فریفتہ۔ شکل و صورت اُس کی داجبی تھی۔ مگر میرا دوست شہد کی بکھی تھا۔ چنانچہ دو مہینے اُن کا معاشرہ چلتا رہا۔ اُس کے بعد وہ اس سے بالکل اجنبی ہو گیا۔

جب اُس کو بتایا گیا کہ رکنی جو تمہاری محبوبہ تھی اور جس کی خاطر تم نے اتنے جھگڑے اپنی کلاس کے طالب علموں سے کئے۔ وہ اگر دوسری جگہ بیاہی جائے

مرد راجی دولہن کو جلد بلائیے۔ مہورت ہو گیا ہے۔ فوراً رکنی پہنچ گئی اور کچھ عرصے کے لیے دولہا کے ساتھ بٹھا دی گئی۔

پیڈت جی نے کچھ پڑھا۔

جس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن ایک دم شادی کے اُس جلسے میں ایک ہڑ لونگ سی مچ گئی۔ جب کار سے ایک دولہا نکل کر سامنے آ گیا اور بلند آواز میں قائم حاضرین کو مخاطب کیا۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔
میں دعوئے دائرہ کر دوں گا۔

وہ دولہا جو ہاتھ پکڑ کر دولہن کو اٹھا رہا تھا بڑی خوفناک آواز میں چلایا۔
ابے جا بے دعوئے دائرہ کرنے کے کچھ لگتے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے پھولوں کا گونگھٹ اٹھا دیا اور اُن ہزار کے قریب آدمیوں سے جو شامیانے کے نیچے تھے کچھ کہنا پیا با مگر قہقہہ کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا۔

دوسری پارٹی کے آدمی بھی ان قہقہوں میں شریک ہوئے کیونکہ جب یہ پھولوں کا پردہ علیحدہ ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ شیخ سلیم ہے۔
رکنی بڑی خفیہ ہوئی مگر شیخ سلیم نے بڑی جرأت سے کام لے کر اُس سے بلند آواز میں پوچھا۔

تم اس چغد کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو رکنی خاموش رہی۔
اچھا جاؤ جہنم میں۔

لیکن ایک دن نہیں پورے تین مہینے تم ہمیں پوچھتی رہی ہو یہ کہہ کر وہ صحیح دوہا کی طرف بڑھا۔ جس کے منہ سے غصے کے مارے جھاگ نکل رہے تھے آگے بڑھ کر اس نے اپنے سارے مار اُس کے گلے میں ڈال دیئے۔

سب براتی بت بنے بیٹھے تھے۔ ہنستا قہقہے لگانا وہ اپنے گھوڑے پر بڑی صفائی سے سوار ہوا اور ایڑھ لگا کر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ گھوڑے سے اتر کر (م دور نکل گئے تھے اس لئے کہ میں اس کے پیچھے گھوڑے کی تیز رفتاری سے بھاگا تھا) اس نے میرا کندھا بڑے زور سے ہلایا کیوں بیٹے تم سے میں نے کیا کہا تھا — اب دیکھ لیا؟

ہوا تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر مجھے ڈر تھا کہیں شیخ سلیم گرفتار نہ ہو جائے میں نے اس سے کہا۔

جو تم نے کیا وہ اور کوئی نہیں کر سکتا لیکن بھائی میرے کہیں ہنسی میں بھینسی نہ ہو جائے فرض کرو اگر کہنی کے باپ نے تمہیں گرفتار کر دیا؟ وہ اکڑ کر بولا۔

اس کے باپ کا باپ بھی نہیں کر سکتا — کون اپنی بیٹی کو عدالت چڑھائے؟ — میں تو اسی وقت گرفتار ہونے کے لئے تیار ہوں۔

اُس نے مجھے تھانے — اُس سالی کے سارے

پول کھول دوں گا ————— میرے پاس اُس کے درجنوں خطوط پڑے ہیں۔

سارے شہر میں یہی افواہ پھیل ہوئی تھی کہ رکنہ کا باپ شیخ سلیم کو ضرور اُس کی گستاخی کی سزا دلوائے گا کہ وہ ساری عمر یا رک — مگر کچھ نہ ہوا جب کئی د گزر گئے تو وہ میرے پاس گاتا ہوا آیا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں۔ پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ شائستہ ہوا

اب میں اصل کہانی کی طرف پلٹتا ہوں جو اس واقعے سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ اور معنی خیز ہے ————— یہ خود اس نے مجھے سنائی جس کی صداقت پر مجھے سو فی صد یقین ہے۔ اس لئے کہ شیخ سلیم جھوٹا کبھی نہیں تھا۔
اس نے مجھے بتایا۔

میں ایرانیوں تھا و ملاں کی لڑکیاں عام یورپین لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں وہی لباس وہی وضع قطع البتہ ناک نفٹے کے لحاظ سے کافی مختلف ہوتی ہیں۔
حتیٰ خرافات دلاں ہوتی ہے شاید ہی سی اور ملک میں ہوتی ہے —————
میں نے دلاں کئی شکا کریں۔ دلاں میرے ایک بڑے افسر کرنل عثمانی تھے۔
حالانکہ ان کا عہدہ جیسا کہ ظاہر ہے مجھ سے بہت بڑا تھا لیکن وہ میرے بڑے مہربان تھے۔

میں میں جب بھی مجھے دیکھتے زور سے پکارتے ادھر اُدھیرے شیخ میرے پاس بیٹھو۔ اور وہ میرے لئے ایک کرسی منگواتے۔ دسکی کا دور چلتا تو ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتے۔

اکرمل عثمانی صاحب کو مجھ سے پھڑخانی کرنے میں خاص مزا آتا۔ جب وہ کوئی فقرہ مجھ پر چسٹ کرتے تو بہت خوش ہوتے۔ کافی عمر آدمی تھا۔ اس کے علاوہ بڑا افسر میں خاموش رہتا۔ اُن کو اُن پولستانی نرسوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ جو وہاں ایمبولنس کو رہیں کام کرتی تھیں۔

یہ پولستانی لڑکیاں ہلاکی تو مند ہوتی ہیں۔ یہ موٹی موٹی پنڈلیاں بڑی مضبوط۔ چھاتیاں بڑی بڑی اور صحت مند۔ کوہے چوڑے درگشت سے بھرے ہوئے جن میں سختی ہو۔ لوہے ایسی سختی

میری کئی دوست تھیں۔ پر جب میں آئرن سے ملا تو سب کو بھول گیا۔ سارے ایران کو بھول گیا۔ بڑی صفیت تھیں۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے تھے اگر تم اُس کی چھاتیوں اور پنڈلیوں کو پیش نہ کر کے تو یہی سمجھتے کہ اس کے ہاتھ ڈبل روٹی کے مانند ہوں گے۔ اس کی انگلیاں اتنی موٹی ہوں گی۔ جیسے کسی درخت کی ٹہنی۔ مگر نہیں دوست اس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور اس کی انگلیاں تم یہ سمجھ لو کہ چغنائی کی بنائی تصویروں کی طرح مخروطی لابی نہیں مگر تپلی تپلی تھیں۔ میں تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔

چند روز کی ملاقاتوں ہی میں اُس کے میرے تعلقات بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئے۔ یہاں تک پہنچ کر شیخ رُک گیا۔ ایک نیا پیگ گلاس میں ڈالا اور سوڈا ملا کر غما غٹ پی گیا نہ یاد کراؤ یہ قصہ۔ میں نے اس سے کہا۔ لیفٹنٹ صاحب آپ نے خود ہی تو شروع کیا تھا۔ اس نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا ایک اور پیگ اپنے گلاس میں ——— تین چار پیگ جو بوتل میں باقی بچ گئے تھے۔

انتقاماً میرے گلاس میں ڈالے اور خود سوکھی جسے انگریزی میں نیٹ کہتے ہیں پی گیا اور کھانس کھانس کر اپنا برا حال کر لیا۔ لعنت ہو تم پر۔ یعنی یہ کیا موقع تھا مجھ پر لعنت بھیجنے کا۔

اُس کی کھانسی بند ہو گئی تھی اب۔ اور وہ رومال سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا کچھ نہ پوچھو میری جان ———

دوسرے روز رات کو کرنل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑے طنز سے کہا۔

ہر جزا دے مجھے تم بڈھا سمجھتے ہو۔ وہ تم نے ضرب المثل نہیں سنی نیا ایک دن پُرانا سودن ——— میں نے اُن سے عرض کی کرنل صاحب آپ کا میرا کیا مقابلہ ——— مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کجخت اس حقیقت سے اب تک غافل ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے

بیٹھا ہے اور عشق فرما رہا ہے۔

میں تو خدا کی قسم جب اس عمر کو پہنچوں گا تو خود کشتی کر لوں گا۔ اس منہ کے ساتھ جس میں آدھے وانٹ مصنوعی ہیں میری آئرن پر لگا ہیں لگائے بیٹھا ہے۔

کر نل ہو گا تو اپنے گھر میں۔

اس نے پھر کبھی اس کی بات کی تو ایک گھولنہ جاؤں گا اس کی سوکھی گردن پر کہ منکا باہر آجائے گا۔

دیر تک اس بڈھے کھوسٹ سے آئرن ————— بنایت ہی پاری آئرن کے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

وسکی کا چوتھا دور چل رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر بڑی فرمانبردار قسم کی مسکراہٹ پیدا کی اور اس سے کہا۔

کر نل صاحب جو آپ کو بڈھا کہے وہ خود بڈھا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ دھان پان ہیں یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔ آئرن نے مجھ سے وعدہ کیا۔

کہ وہ دوسرے روز فلاں فلاں ہوٹل میں شام کو شات بے ملے گی۔

اس میں فوجیوں کو اجازت تھی۔

اتوار تھا اس لئے میں وردی کے بجائے نہایت اعلیٰ اسوٹ پہن کر دہاں پہنچا
سات بجنے میں ابھی نو منٹ باقی تھے۔

میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو میرے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے۔
کرنل عثمانی صاحب اس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے غافل آئرن کا بڑا لمبا
بوسہ لے رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ارل سے کہیں زیادہ
بڈھا کھوسٹ بن گیا ہوں۔